کربلا سے

بالاکوٹ تک

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

مطبوعات اشاعتِ اسلام ٹرسٹ ـــــــ ۳۵۴

کاروانِ اہلِ حق

کربلا سے بالاکوٹ تک

محمد سلیمان فرخ آبادی

مرکزی مکتبہ اسلامی
دھلی ۶

خوشا وہ آبلہ پا کاروانِ اہلِ جنوں
لٹا گیا جو بہاروں پہ اپنی سُرخیِ خوں

(شمسؔ نوید عثمانی)

اُف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گذر سے گذرے

(حفیظؔ میرٹھی)

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

افتتاحیہ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ط

اسلام دین فطرت ہے۔ خدا کی عبادت اور اطاعت انسان کے خمیر میں شامل ہے اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ پالنے پوسنے والے کی پوجا، پرستش اس کی فطرت میں پڑی ہوئی ہے۔ ہر انسانی بچّہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے۔ ماں باپ، گھر، ماحول اور سوسائٹی اگر اسے غلط راہوں پر نہ ڈال دیں اور اسلام کی سادہ تعلیم اس کے سامنے آئے تو اس کی سادہ فطرت بہت آسانی سے اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتی ہے۔

تاریخ میں کوئی سوسائٹی اور گروہ ایسا نہیں گذرا جو کسی نہ کسی کو معبود مان کر اس کے آگے سر نیاز جھکاتا نہ ہو۔ یہ بات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا پرستی انسان کی فطرت ہے اور اس کے ضمیر کی آواز ہے۔ متمدّن اور وحشی دونوں قسم کی قومیں ہمیشہ کسی نہ کسی کو خدا مان کر اپنی نیازمندیاں اس سے وابستہ کرتی رہی ہیں، اس سے رحمتیں طلب کرتی اور اس کے غضب سے خوف کھاتی رہی ہیں۔

تاریخ اگر ایک طرف یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ہر گروہ اور قوم نے کسی نہ کسی کو خدا مان کر اسے پوجا ہے اور ہر سوسائٹی میں خدا پرستی کا چلن رہا ہے تو دوسری طرف تاریخ ہی سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ خدا پرستی کے سلسلہ میں انسانی افراد اور جماعتوں نے بارہا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ فکر و عمل کے میدانوں میں

بھٹک کر انسان، ضلالت اور گمراہی کے عمیق غاروں اور کھڈوں میں جاگرا ہے۔ کبھی اس نے خدا کی ذات وصفات میں غیر اللہ کو شریک کیا ہے اور کبھی اس کے حقوق واختیارات میں دوسروں کو شامل کیا ہے، کبھی خدا کی مخلوقات میں خدا کی صفات فرض کر کے گمراہ ہوا ہے اور کبھی مخلوقات کی صفات خدا میں فرض کر کے ضلالت میں مبتلا ہوا ہے۔

انسان صرف فکر ونظر اور عقیدہ وخیال ہی کے پہلو سے غلط اور مہلک وادیوں میں نہیں بھٹکا ہے بلکہ اخلاق وکردار کے پہلو سے معاشرت اور معیشت اور سیاست اور اجتماعیت کے پہلو سے بھی وہ بار ہا انسانیت سے فروتر حرکتیں کرتا رہا ہے۔ اس نے ظلم ڈھائے ہیں، بربریت اور درندگی کا مظاہرہ کیا ہے اور فتنۂ وفساد برپا کیا ہے، وہ امن وامان کو غارت کرنے کا جرم کرتا رہا ہے، اس نے بے حیائیاں پھیلائی ہیں۔ غرض کہ اس نے زندگی کو گندگی سے بھر دیا ہے حتیٰ کہ سوسائٹی میں تعفّن پیدا ہو گیا اور فضا زہر آلود ہو گئی اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انسان نے توحید یعنی خدا پرستی کے صحیح تصوّر کے بجائے شرک یعنی خدا پرستی کے غلط اور مہلک تصورات کو اپنا لیا۔

ایسے ہی کچھ حالات ہوتے تھے جب اللہ تعالیٰ کسی شخصیت کو نبی اور رسول بنا کر اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کرتا تھا جو افراد کی تعمیر سیرت اور سوسائٹی کی اصلاح کے ساتھ ساتھ پورے نظام تہذیب وتمدن میں انقلاب — صالح اور تعمیری انقلاب — برپا کرنے کی کوشش اور جد وجہد کرتا تھا۔ صدیوں اور قرنوں تک یہی سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ سب سے آخر میں اللہ تعالیٰ نے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو اپنی آخری، کامل اور جامع کتاب دے کر بھیجا۔ نبی کریم ﷺ نے افراد کی تعمیر سیرت، اصلاح معاشرہ اور سماج

سدھار کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک ہمہ جہتی اور عظیم انقلاب برپا کر کے خدائی نظام فکر و عمل، عملاً قائم کیا۔

چھٹی صدی عیسوی میں جب کہ حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے دنیا میں بگاڑ نے ہمہ گیر صورت اختیار کر لی تھی۔ دنیا کا کوئی گوشہ انسانوں کا کوئی طبقہ اور زندگی کا کوئی شعبہ اور رُخ یا پہلو ایسا نہیں تھا جو بگاڑ کا شکار نہ ہو چکا ہو اور فساد نے جسے اپنے گھیرے میں نہ لے لیا ہو۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔ — انسانی کرتوں کی وجہ سے خشکی اور تری سب میں فساد غالب ہو گیا۔

غرض کہ فکر و نظر، عقیدہ و خیال، اخلاق و اعمال، معاشرت اور معیشت، سب میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ مذہب اور سیاست ہر پہلو سے پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی بھرپور بگاڑ میں مبتلا تھی۔ انسانیت اپنا مقام بلند بھول چکی تھی، اپنا اعلیٰ نصب العین کھو چکی تھی، اپنی منزل سے غافل ہو چکی تھی، وہ حیوانیت کے ذلّت آمیز گڈھے میں پڑی سسکیاں لے رہی تھی، بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ ناکارہ نکمّی اور گمراہ ہو چکی تھی۔

أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا۔ — وہ جانوروں جیسے بلکہ ان سے بھی گئے گذرے ہیں۔

اس ہمہ گیر فساد اور ہمہ جہتی بگاڑ کی اصلاح اور سدھار کے لیے دین و شریعت بھی جامع اور مکمل درکار تھی۔ صرف مذہب یا صرف سیاست کی اصلاح سے یا ان دونوں میں سے کسی ایک میں انقلاب برپا کرنے سے کام نہیں چل سکتا تھا بلکہ پورے نظامِ زندگی اور دین میں تبدیلی و انقلاب کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہادی کامل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپؐ نے

ہمہ جہتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ہمہ گیر انقلاب کی تحریک چلائی ۔ آپؐ کی بہت سی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ آپؐ نے تصورِ خدا اور تصورِ مذہب میں انقلاب پیدا کیا۔

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم مٹ چکی تھی ۔ لوگ شرک اور رہبانیت کو مذہب اور روحانیت کا معیار کمال سمجھنے لگے تھے ۔ خدا اور مذہب کو پرائیوٹ اور انفرادی زندگی تک محدود کر دیا تھا ۔ اجتماعی اور قومی، ملکی اور سیاسی زندگی کو خدا اور مذہب سے بیگانہ اور آزاد بنا دیا گیا تھا ۔ جناب نبی کریمؐ کی صاف تعلیم یہ تھی اور ہے کہ خدا تمہارا خالق اور مالک اور حاکم ہے نہ صرف کسی ایک جزؤ حصے یا پہلو کا بلکہ تمہارے کل وجود کا مالک ہے، نہ صرف تمہارا طبعی بلکہ تشریعی حاکم بھی ہے ۔ تمہاری پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے اس نے ہدایات، احکام اور قوانین دیے ہیں ۔ وہ تمہارا کامل رب ہے میں تمہارا کامل رہنما ہوں ۔ اس کی کتاب پوری زندگی کے لیے ہدایت، دستور اور قانون ہے ۔ تمہارے لیے صحیح راہ اور صراط مستقیم صرف یہ ہے کہ تم اللہ کی کامل اطاعت اور میری کامل پیروی کرو ۔ اللہ کی خوشنودی کا مقام حاصل کرنے کی صرف ایک راہ ہے ۔ اللہ کی کامل اطاعت انفرادی اور اجتماعی زندگی میں، اور رسول کی کامل اتباع انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں۔

یہی وہ تصور خدا اور تصور مذہب تھا جس کی بنیاد پر نبیؐ نے انفرادی سیرتیں تعمیر کیں، معاشرہ کی تعمیر نو اور سلطنت کی تشکیل بھی خدا اور مذہب کے اسی تصور کی اساس پر آپؐ نے انجام دی۔

(۱ھ ۶۲۲ء تا ۱۱ھ ۶۳۲ء) مکمل دس سال حضورؐ خود بنفس نفیس اسی تصور پر قائم حکومت کے سربراہ اور صدر رہے جو آپؐ کی مبارک زندگی کے آخری برسوں

میں پورے جزیرۃ العرب پر پھیل چکی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ (۱۱ھ/۶۳۲ء تا ۱۳ھ/۶۳۴ء) نے تقریباً دو سال پانچ ماہ تک اس تصور پر نہ صرف حکومت کو باقی رکھا بلکہ اسے مستحکم کیا بلکہ اسے جزیرۃ العرب کے آس پاس عراق اور شام کے ملکوں تک وسعت عطا کی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ منتخب ہوئے۔ آپؓ نے (۱۳ھ/۶۳۲ء تا ۲۳ھ/۶۴۴ء) مکمل دس برس بڑی شان و شوکت، بڑے تدبر اور حکمت و دانائی کے ساتھ اسی تصور پر حکومت کو نہ صرف باقی رکھا نہ صرف مستحکم کیا بلکہ عراق و شام سے آگے مشرق میں ایران کے بیشتر رقبہ پر اور مغرب میں فلسطین اور مصر تک اسے پھیلا دیا۔

پھر حضرت عثمانؓ خلیفہ منتخب ہوئے۔ آپؓ نے (۲۳ھ/۶۴۲ء تا ۳۵ھ/۶۵۵ء) مکمل ۱۲ برس اسی تصور خدا اور اسی تصور مذہب کے مطابق نہ صرف حکومت کی نہ صرف اسے باقی رکھا بلکہ پورے ایران اور خراسان پر اور مغرب میں افریقہ کے ایک بڑے رقبہ پر اسے پھیلا دیا۔ چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ منتخب ہوئے۔ آپ اگرچہ حکومت کو استحکام نہیں دے سکے، اسے مزید وسیع بھی نہ کر سکے لیکن اسی تصور پر اسے قائم رکھا جس پر اللہ کے رسولؐ اور آپ کے پہلے تین جانشینوں نے قائم رکھا تھا۔ (۳۵ھ/۶۵۴ء تا ۴۰ھ/۶۵۹ء)

اللہ کی حاکمیت اور اللہ کے فرمانبردار بندوں کی خلافت کے تصور پر مبنی یہ نظم مملکت شورائی اور جمہوری نظام تھا۔ واضح رہے آج کل جسے جمہوریت کہا جاتا ہے (Democracy) وہ بالکل دوسری چیز ہے اور اسلامی جمہوریت بالکل دوسری چیز ہے۔

اسلام کا نظریۂ سیاسی سمجھنے کے لیے چند سوال اور ان کا جواب سامنے آجانا ضروری ہے۔ حکومت کا تصور آتے ہی سوال پیدا ہوتا ہے حاکم کون؟

اس سوال کا جواب ہمیشہ ایک ہی دیا گیا ہے اور ہر ایک نے ایک ہی دیا ہے کہ حاکم وہ جو مالک ہے گویا یہ جواب متفقہ جواب ہے۔ تاریخ کے ہر دور کے انسانوں کا، ہر مذہب وخیال کے لوگوں کا، اسلام اور غیر اسلام سب کا یہی جواب ہے کہ حاکم وہ ہے جو مالک ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا کہ مالک کون؟

اس سوال کا جواب ہر زمانہ اور ہر دور کے انسانوں نے مختلف دیا ہے۔ کسی زمانہ میں قبیلہ کا شیخ اور خاندان کا چودھری کسی زمانہ میں جاگیردار، کسی زمانہ میں کوئی خاندان، کوئی خاص شخص، کوئی فاتح مالک سمجھا گیا ہے۔ اور آج کے دور میں عوام کو کسی بھی ملک اور خطۂ زمین کے باشندوں کو وہاں کا مالک سمجھا جاتا ہے لیکن اسلام کا جواب "از آدم تا ایں دم" ہمیشہ ایک ہی رہا ہے کہ مالک انسان نہیں بلکہ اللہ ہے۔ خود سوچو، زمین کا کون مالک ہے، وہ جو زمین کا خالق ہے یا وہ جو زمین پر پیدا ہوا ہے؟ جب عقل یہ کہتی ہے کہ جو خالق ہے وہی مالک ہے تو پھر یہ کیسی بے عقلی کی بات ہے کہ عوام زمین کے مالک ہیں۔ معلوم ہوا اللہ ہی حاکم ہے کیونکہ وہی زمین کا مالک اور خالق ہے۔ ہر حکومت کے لیے قانون درکار ہے۔ قانون کے بغیر حکومت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا لہٰذا تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون کس کا؟

اس سوال کا جواب بھی ہمیشہ سے سب کے نزدیک ایک ہی ہے وہ یہ کہ قانون اس کا جو حاکم ہے۔ اور جب یہ طے ہو گیا کہ حاکم انسان نہیں ہے تو یہ بھی خود بخود طے ہو گیا کہ قانون بھی اللہ کا۔

اب سوال یہ ابھرا کہ مالک اللہ، حاکم بھی اللہ، قانون بھی اللہ ہی کا تو پھر یہ انسان کیا ہے؟ انسان کی اس کائنات میں اور زمین پر کیا حیثیت اور پوزیشن ہے۔؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسان خدا کا نائب اور خلیفہ ہے، اس کے نائب کی حیثیت سے اس کی حکومت قائم کرنا اور قائم رکھنا اور اس کا قانون اس کی زمین پر نافذ کرنا اس کا فریضہ ہے۔ وہ اپنے اس حقیقی حاکم کو جو اس کا خالق اور مالک بھی ہے اسی طرح خوش کر سکتا ہے کہ اس کی حاکمیت اور انسان کی خلافت کی بنیاد پر تزکیۂ نفس، تعمیر معاشرہ اور تشکیل حکومت کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ کھپا دے۔

ایک سوال اور ہے وہ یہ کہ انسان تو کروڑوں ہیں پھر اس کی خلافت کا کام عملاً کون کرے گا؟ جب کہ نظم و انتظام کی روح وحدت چاہتی ہے کوئی بھی حکومت بغیر کسی ایک سربراہ اور ذمہ دار کے عملاً کس طرح چل سکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے قانون طبعی میں تو سارے ہی انسان اس کے خلیفہ ہیں اور قانون طبعی کے تحت وہ کار خلافت بھی انجام دے رہے ہیں لیکن انسان کی اختیاری زندگی کے لیے صرف اس کے وفادار بندے ہی اس کی خلافت کے مستحق ہیں۔

لیکن لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل بھی تو کروڑوں ہیں۔ لہٰذا سوال اپنی جگہ باقی رہا کہ خلیفہ کون؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صلاحیت اور صالحیت کی بنیاد پر انتخاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے مسلم بندے اپنے اندر سے جس بہترین بندے کو منتخب کر لیں گے وہ خلیفہ ہوگا۔ جو بیک وقت سہ طرفی خلافت کا حامل ہوگا' خدا، خدا کے نبیؐ اور خدا کے وفادار بندے تینوں کا خلیفہ ہوگا یعنی خلیفۃ اللہ بھی، خلیفۃ الرسول بھی اور خلیفۃ المسلمین بھی اور تینوں کی خلافت کا اسے حق ادا کرنا ہوگا۔

یہی وہ خلافت ہے جسے خلافت راشدہ کہا جاتا ہے جس کا سلسلہ

حضرت علیؓ یا حضرت حسنؓ پر ختم ہوگیا جس کا آفتاب ایک بار پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں طلوع ہوا اور پورے آب و تاب کے ساتھ چمکا لیکن پھر غروب ہوگیا۔ واضح رہے خلافت کی صفت رشد کو گہن لگ گیا تھا خلافت ہرگز ختم نہیں ہوئی تھی۔ یہی ملوکیت کا گہن تھا جس سے، حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اور دیگر مجاہدین اور مجددین خلافت کو نکالنا اور پھر خلافت راشدہ کی شکل دینا چاہتے تھے۔ یہی شخصی اور خاندانی گہن تھا جس سے اسلامی سلطنت کو پاک کرنے کا انھوں نے بیڑا اٹھایا تھا۔

حضرت علیؓ کی شہادت (۴۰ھ) کے بعد حضرت حسنؓ خلیفہ چنے گئے۔ لیکن صرف چھ ماہ کے بعد وہ امیر معاویہؓ کے حق میں دست بردار ہوگئے۔ اس طرح حضرت امیر معاویہؓ پوری اسلامی سلطنت کے کرتا دھرتا ہوگئے اور مکمل ۲۰ برس (۴۱ھ تا ۶۰ھ) بڑے طمطراق سے حکومت کی جو اگرچہ خلافت راشدہ یعنی آئیڈیل اور معیاری اسلامی حکومت نہیں تھی مگر اسلامی حکومت ضرور تھی! ان کا دور کئی پہلوؤں سے دورِ فاروقی کا منظر پیش کرتا ہے۔ ان کے دور حکومت میں مذہب و سیاست کی تفریق نہیں تھی۔ ان کا بھی وہی تصور خدا اور تصور مذہب تھا جو خلفائے راشدین کا تھا۔ البتہ انھوں نے چونکہ انتخاب کے ذریعہ نہیں طاقت کے ذریعہ حکومت حاصل کی اور اپنے بیٹے یزید کو حکومت منتقل کرنے کے لیے بھی طاقت ہی سے کام لیا تھا۔ یہ دونوں طریقے ایسے تھے کہ رخصت پر عمل کرنے والے تو اسے برداشت کرسکتے تھے اور کتنے بزرگ تھے جنھوں سے اسے برداشت کیا۔ حالانکہ اگر خلیفہ وقت یا سربراہ حکومت سے ایسا فعل رونما ہوتا جسے وہ لوگ کفر بواح (کھلا ہوا کفر) شمار کرتے یا اس سے اقامت صلوٰۃ کی خلاف ورزی دیکھتے تو ہرگز وہ اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرسکتے تھے لیکن کوئی تو عزیمت پر

عمل کرنے والا مجاہد ہو نا ہی تھا ورنہ خدا اور مذہب کا وہ تصور جو اللہ اور اس کے رسول نے دیا تھا وہ رہبانیت کا رخ اختیار کر لیتا پھر دینِ اسلام دین نہیں رہتا بلکہ مذہب اور سیاست کی تفریق سے وہ صرف مذہب (ریلیجن) رہ جاتا ہے۔ دین کے سیاسی پہلو میں بدعت سر اٹھا رہی تھی۔ شورائیت اور انتخاب کے بجائے نامزدگی اور ولی عہدی رو نما ہو رہی تھی تو کیا اس بدعت کے لیے کسی قامع بدعت اور محیٔ سنّت کی ضرورت نہیں تھی —— آپؐ کے بعد آپؐ کے سچّے جانشینوں نے اس کام کو جاری رکھا۔ تعمیر سیرت، اصلاح معاشرت اور قیام سلطنت ہر پہلو سے آپؐ کی سچّی جانشینی کا ثبوت دیا پھر تاریخ میں اتار چڑھاؤ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ انحطاط نے اپنے آہنی پنجے گاڑ دیے۔ کچھ لوگ تعمیر سیرت کا کام سنبھال کر بیٹھ گئے، کچھ دوسروں نے اصلاح معاشرہ کا بیڑا اٹھایا، سیاست و جہاں بانی پر الگ طبقہ نے قبضہ جمایا اور من مانیاں کرنے لگے۔ غرض کہ نظام ملّت درہم برہم ہو گیا —— تقسیم کار اگر ایک منصوبے کے تحت ہو اور نظام سلطنت اپنی مرکزیت اور آب و تاب کے ساتھ قائم اور برپا ہو تب تو مفید اور نتیجہ خیز ہوتی ہے لیکن نظم اجتماعی درہم برہم ہونے کی وجہ سے ہر شعبہ الگ ہو گیا ہو تو پھر یہ الگ الگ شعبے اپنی افادیت کھو دیتے ہیں بلکہ جنگل کی خودرو جھاڑیوں کی شکل اختیار کر کے باغ و چمن کو ایک صحرا بنا دیتے ہیں اور نظم اجتماعی کا بلند قلعہ بکھری ہوئی اینٹوں اور روڑوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے چنانچہ ملّت اسلامیہ کا بھی یہی حال ہوا —— اگرچہ نبوت کا دروازہ بند ہو چکا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے مجدد دین کا سلسلہ قائم کیا اور مصلحین کا ایک تانتا بندھ گیا۔ مولانا علی میاں مدظلہٗ لکھتے ہیں۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کی اس طویل اور پُر آشوب

تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت بھی ایسی نہیں آئی جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہو گئی ہو، حقیقت اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو، امت اسلامیہ کا ضمیر بالکل بے حس ہو گیا ہو اور تمام عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لیے فتنہ نمودار ہوا اس کی تحریف اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی یا اس کو غلط طریقے پر پیش کیا گیا، یا مادّیت کا کوئی سخت حملہ ہوا تو کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آ گئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور اس کو میدان سے ہٹا دیا۔ بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں، لیکن آج ان کا وجود صرف کتابوں میں رہ گیا ہے۔ ان کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہے۔ کتنے آدمی ہیں جو قدریت" "جہمیت" "اعتزال" "خلق قرآن" "وَحدۃُ الوجود" اور اکبر کے "دین الٰہی" کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں۔ حالانکہ یہ اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد و مذاہب تھے ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں اور اپنے زمانے کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علمبردار تھے لیکن بالآخر حقیقت اسلام نے ان پر فتح پائی اور کچھ عرصے کے بعد یہ زندہ تحریکیں اور سرکاری مذہب علمی مباحث بن کر رہ گئے جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ دین کی حفاظت کی یہ جدوجہد تجدید و انقلاب کی کوششیں اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی اسلام کی تاریخ اور ویسا ہی مسلسل ہے جیسی مسلمانوں کی زندگی (الفرقان لکھنؤ جلد ۲۰ ۳/۱ - ۵)۔

لیکن مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا تصور دین بلند اور وسیع ہے ہمہ گیر اور جامع ہے اسی لیے ان کا معیار اصلاح و تجدید بھی بہت اونچا وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ وہ لکھتے ہیں "اس کار تجدید کے مختلف شعبے حسب ذیل ہیں۔

۱- اپنے ماحول کی صحیح تشخیص، یعنی حالات کا پورا جائزہ لے کر یہ سمجھنا کہ جاہلیت کہاں کہاں کس حد تک سرایت کر گئی ہے، کن کن راستوں سے آئی ہے، اس کی جڑیں کہاں کہاں اور کتنی پھیلی ہوئی ہیں اور اسلام اس وقت ٹھیک کس حالت میں ہے؛

۲- اصلاح کی تجویز، یعنی یہ تعین کرنا کہ اس وقت کہاں ضرب لگائی جائے کہ جاہلیت کی گرفت ٹوٹے اور اسلام کو پھر اجتماعی زندگی پر گرفت کا موقع ملے۔

۳- خود اپنے حدود کا تعین، یعنی اپنے آپ کو تول کر صحیح اندازہ لگانا کہ میں کتنی قوت رکھتا ہوں اور کس راستے سے اصلاح کرنے پر قادر ہوں؛

۴- ذہنی انقلاب کی کوشش، یعنی لوگوں کے خیالات کو بدلنا، عقائد و افکار اور اخلاقی نقطۂ نظر کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا، نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح اور علوم اسلامی کا احیاء کرنا اور فی الجملہ اسلامی ذہنیت کو از سر نو تازہ کر دینا۔

۵- عملی اصلاح کی کوشش یعنی جاہلی رسوم کو مٹانا، اخلاق کا تزکیہ کرنا، اتباعِ شریعت کے جوش سے پھر لوگوں کو سرشار کر دینا اور ایسے افراد تیار کرنا جو اسلامی طرز کے لیڈر بن سکیں۔

۶- اجتہاد فی الدین یعنی دین کے اصولِ کلّیہ کو سمجھنا، اپنے وقت کے تمدنی حالات اور ارتقاءِ تمدّن کی سمت کا اسلامی نقطہ نظر سے صحیح اندازہ لگانا اور یہ تعین کرنا کہ اصول شرع کے ماتحت تمدّن کے پرانے متوارث نقشے میں کس طرح ردو بدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے، اس کے مقاصد پورے ہوں اور تمدّن کے صحیح ارتقاء میں اسلام دنیا کی امامت کر سکے۔

۷- دفاعی جد و جہد یعنی اسلام کو مٹانے اور دبانے والی سیاسی طاقت کا مقابلہ کرنا اور اس کے زور کو توڑ کر اسلام کے لیے ابھرنے کا راستہ پیدا کرنا۔

۸- احیاء نظام اسلامی یعنی جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور از سر نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا جسے صاحب شریعت علیہ السلام نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

۹- عالمگیر انقلاب کی کوشش، یعنی صرف ایک ملک یا ان ممالک میں جہاں مسلمان پہلے سے موجود ہوں، اسلامی نظام کے قیام پر اکتفا نہ کرنا، بلکہ ایک ایسی طاقت اور عالمگیر تحریک برپا کرنا جس سے اسلام کی اصلاحی اور انقلابی دعوت عام انسانوں میں پھیل جائے، وہی تمام دنیا کی غالب تہذیب بنے، ساری دنیا کے نظام تمدن میں اسلامی طرز کا انقلاب برپا ہو اور عالم انسانی کی اخلاقی، فکری اور سیاسی امانت و ریاست اسلام کے ہاتھ میں آجائے (تجدید و احیاء دین)

اس سلسلہ میں تاریخ میں جن بزرگوں نے کارنامے انجام دیے ہیں ان میں سے صرف ۱۲ بزرگوں کا تذکرہ اور ان کے کام کا تعارف "کربلا سے بالاکوٹ تک" میں کرایا گیا ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ انشاء اللہ یہ تذکرہ مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔ آپ کے مشورے شکریے کے ساتھ قبول کیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس مجموعہ کو میرے اور میرے والدین کے لیے ذریعہ نجات اور مغفرت کا باعث بنائے۔ آمین یارب العٰلمین۔

احقر- محمد سلیمان غفرلہٗ فاضل دیوبند
کوچہ لالہ میاں رام پور- یو- پی
۴ مارچ ۱۹۷۱ء

حضرت حسین ابن علی رضؓ

ایک مصلح اور مجدد

۴ھ — ۶۱ھ

حضرت حسین رضؓ بروز دوشنبہ ۳ شعبان ۴ھ (۸ جنوری ۶۲۶ء) میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ رضؓ نے حضرت فاطمہ رضؓ حضرت علی رضؓ اور حضور صؐ کی گود میں پرورش پائی اور نبوت کے گھر میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ حضور صؐ کا جب ربیع الاول ۱۱ھ میں انتقال ہوا تو آپ ابھی صرف ۷ برس کے نونہال تھے۔ چھ ماہ بعد حضرت فاطمہ رضؓ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس طرح آپ ۷-۸ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے حضور صؐ جیسے شفیق ترین نانا اور حضرت فاطمہ رضؓ جیسی شفیق ترین ماں کی مامتا اور سایہ سے محروم ہوگئے۔ لیکن حضرت علی رضؓ جیسے شفیق ترین باپ کی پدرانہ شفقت نے آپ کا غم غلط کر دیا۔

حضرت حسین رضؓ حافظ قرآن تھے۔ حضور صؐ کی احادیث اور کتاب اللہ کے معانی پر آپ کی خاصی نگاہ تھی۔ اطاعتِ خدا اور اتباعِ نبوی میں کامل تھے۔ تقویٰ و طہارت اور حق گوئی و بے باکی اور جہاد فی سبیل اللہ آپ کا شعار تھا۔ دورِ صدیقی اور عہدِ فاروقی میں آپ نوعمر تھے۔ البتہ حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں آپ اچھے جوان اور سپاہی

تھے چنانچہ فتح طبرستان کے لشکر میں جو سعید بن العاص کی سرکردگی میں گیا تھا آپ سرفروشانہ شریک تھے۔

حضرت عثمان رضؓ کے مکان کو جب باغیوں نے گھیر لیا تھا تو ان کی حفاظت کے لیے حضرت علی رضؓ نے آپ کو مقرر کیا تھا۔ لیکن باغی کسی دوسری جانب سے مکان میں داخل ہو گئے اور حضرت عثمان رضؓ کو شہید کر دیا۔

دورِ حیدری میں آپ برابر اپنے والد حضرت علی رضؓ کا دست و بازو رہے حضرت علی رضؓ کی شہادت (۴۰ھ) کے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت حسن رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں آپ آگے آگے تھے لیکن جب چھ ماہ بعد وہ امیر معاویہ رضؓ کے حق میں دست بردار ہو گئے تو اس کو حضرت حسین رضؓ نے سخت ناپسند کیا اور شدید ناگواری کا اظہار کیا لیکن جب حضرت حسن رضؓ نے کہا کہ میں اس بات کو تم سے زیادہ جانتا ہوں تو بھائی کی رائے کا احترام کیا اور خاموش ہو گئے۔

فاروق اعظم رضؓ نے جب تمام مسلمانوں کے وظیفے مقرر کیے تو حضرت حسین رضؓ کا وظیفہ پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر فرمایا۔ حضرت عثمان رضؓ کے دور میں بھی یہ وظیفہ آپ کو برابر ملتا رہا یہ وظیفہ حضرت امیر معاویہ رضؓ نے اپنے دور میں دس[1] لاکھ درہم تک بڑھا دیا جو حسین رضؓ کو برابر ملتا رہا۔

۴۰ھ میں حضرت حسن رضؓ حضرت امیر معاویہ رضؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے تو اس طرح مسلمان ایک بار پھر متحد ہو گئے اور وہ تلوار جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے وقف تھی اور بدقسمتی سے حضرت عثمان رضؓ کی شہادت سے اس کا رخ خود مسلمانوں کی طرف ہو گیا تھا اور پورے دورِ حیدری رضؓ میں مسلمان اپنا ہی خون بہانے میں مصروف

---

[1] اور بعض روایات کے اعتبار سے اس کا بھی دوگنا۔

رہے تھے وہ تلوار پھر جہاد، اعلاء کلمۃ اللہ اور اتحاد ملّت کے لیے وقف ہو گئی۔
اسلامی اتحاد حضرت امیر معاویہؓ اور بعض دیگر صحابہ کرامؓ کے نزدیک اس قدر اہم تھا کہ اس کے لیے وہ یزید جیسے نسبتاً کم استحقاق رکھنے والے شخص کو اپنی زندگی ہی میں نامزد کرنے بلکہ باقاعدہ ولی عہد بنانے پر آمادہ ہو گئے۔ اتنا ہی نہیں مزید اس کے لیے طاقت اور دباؤ سے کام لینے میں بھی انھوں نے باک محسوس نہیں کیا۔

حضرت امیر معاویہؓ نے نیک نیتی کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے پیشِ نظر ایسا ضروری خیال کیا تھا لیکن کوئی کام بھی جو غلط ہو وہ محض نیک نیتی سے درست نہیں ہو سکتا وہ غلط ہی رہے گا اور اس سے نتائج بھی غلط ہی نکلیں گے۔
چنانچہ طاقت حکومت حاصل کرنے سے اگر خلافت نے ملوکیت کی طرف ایک قدم بڑھایا تھا تو اب ولی عہدی کے اجرا نے دوسرا قدم بھی ملوکیت کی طرف بڑھا دیا۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مدینہ کے گورنر مروان بن حَکَم نے جب یزید کی جانشینی کا اعلان و اظہار کیا تو دینی بصیرت رکھنے والے چند حق گو سامنے آئے اور برملا اس کی مخالفت کی۔ عبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ نے کہا:۔

تم اور معاویہؓ دونوں غلط کہتے ہو اس سے امت کی بھلائی مقصود نہیں ہے بلکہ خلافت کو ہرقل کی شاہنشاہی بنانا چاہتے ہو کہ ایک ہرقل کے بعد دوسرا ہرقل اس کا جانشین ہو[1]۔ مروان نے کہا امیر المومنین (حضرت امیر معاویہؓ) کی منشا ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح یزید کو نامزد کر جائیں۔ عبدالرحمٰن ابن ابوبکرؓ نے اس کے جواب میں کہا یہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی سنت نہیں بلکہ قیصر و کسریٰ کا طریقہ ہے۔ ان دونوں نے اپنے

---

[1] تاریخ اسلام دوم (دار المصنفین اعظم گڑھ ص ۲۳)

لڑکوں کو ولی عہد نہیں بنایا بلکہ خاندان والوں کو بھی اس سے دور رکھا۔

محمد بن عمرو بن حرم نے کہا ہر راعی اپنی رعیت کا ذمہ دار ہے اس لیے جسے آپ امت کا راعی بناتے ہیں اس پر خوب غور کر لیجیے۔

رئیس بصرہ احنف بن قیس نے کہا اگر ہم سچ کہتے ہیں تو (اے امیرالمومنین) آپ کا ڈر ہے اور جھوٹ بولتے ہیں تو خدا کا خوف ہے۔ بہر حال حضرت امیر معاویہ رضؓ نے کچھ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر اور کچھ کو لطف و کرم سے ہموار کر لیا اور عراق و شام کے باشندوں نے یزید کی بیعت کر لی لیکن دراصل اہمیت حجاز کی تھی۔ لہٰذا امیر معاویہ رضؓ نے خود حجاز کا سفر اختیار کیا۔ چند حضرات عبداللہ بن عمر رضؓ، عبداللہ بن زبیر رضؓ، حسین بن علی رضؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضؓ نے بیعت نہیں کی اور مدینہ سے مکہ چلے گئے۔ حضرت امیر معاویہ رضؓ بھی مکہ پہنچ گئے۔ پہلے تو ہر ایک سے الگ الگ گفتگو کی مگر کوئی ہموار نہیں ہوا۔ آخر سب نے اپنا نمائندہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ کو بنا دیا۔ لہٰذا انھوں نے کہا انتخابِ خلیفہ کی تین نظیریں ہیں۔

۱۔ کسی کو نامزد نہ کیجیے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو نامزد نہیں کیا۔ مسلمان خود کسی کو منتخب کر لیں گے۔

۲۔ یا ابوبکر رضؓ کی طرح ایسے شخص کو نامزد کیجیے جس کا آپ سے کوئی تعلق نہ ہو۔

۳۔ یا عمر رضؓ کی طرح چند آدمیوں کی مجلس شوریٰ پر چھوڑ دیجیے تاکہ وہ کسی کو اپنے اندر سے منتخب کر لیں۔

حضرت امیر معاویہ رضؓ نے جب دیکھا کہ یہ لوگ اس طرح ماننے والے نہیں ہیں تو تلوار سے کام لینے کی دھمکی دی۔ بہر حال یزید ولی عہد ہو گیا مگر حسین بن علی رضؓ اور عبداللہ بن زبیر رضؓ نے بیعت نہیں کی۔ حضرت امیر معاویہ رضؓ کا رجب ۶۰ھ میں انتقال ہو گیا۔

یزید نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ان حضرات سے بیعت لینے کی طرف توجہ کی جنھوں نے اسے ولی عہد تسلیم نہیں کیا تھا۔ مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ کو تاکیدی حکم دیا کہ ان حضرات سے بیعت لے لو۔ ولید نے عبداللہ ابن زبیرؓ اور حسین ابن علیؓ دونوں کو بلایا، گفتگو کی اور بیعت کا مطالبہ کیا مگر یہ دونوں حضرات کسی طرح اپنا پیچھا چھڑا کر مکہ معظمہ میں جا کر پناہ گزین ہو گئے۔ کیونکہ آپ یزید کی غیر موروثی بادشاہت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے[1]

اہل کوفہ کے خطوط

کوفہ کے شیعوں نے جب دیکھا کہ حسین بن علیؓ نے یزید کی بیعت نہیں کی ہے تو انھوں نے سیکڑوں خطوط بھیجے۔ وفد بھی بھیجا کہ ہم آپ کو خلیفہ اور امام تسلیم کرتے ہیں۔ تشریف لائیے ہم ہر طرح تیار ہیں۔ ہم یزید کو خلیفہ تسلیم نہیں کرتے۔ حضرت حسینؓ کے پاس جب سیکڑوں خطوط پہنچے تو آپ کو توقع قائم ہوئی کہ حکومت نے جو غیر اسلامی رُخ اختیار کر لیا ہے اسے صحیح اسلامی رُخ پر لانے کا یہ بہترین موقع اللہ نے فراہم کیا ہے۔ اس موقع کو ضائع کرنا خدا کی ناشکری ہے۔ اگر میں اس موقع کو ضائع کر دوں گا تو یقیناً اللہ کے یہاں مجھ سے باز پرس ہو گی۔ پھر بھی آپ نے تحقیق حال کے لیے پہلے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو بھیجنا ضروری خیال کیا۔ اور جب انھوں نے لکھا کہ اٹھارہ ہزار کوفیوں نے بیعت کر لی ہے، حالات موافق ہیں آپ فوراً تشریف لے آئیے تب آپ نے کوفہ روانگی کا پروگرام بنایا لیکن ان حالات کی اطلاع جب یزید کو ہوئی کہ مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر ہزارہا کوفیوں نے حسین بن علیؓ کے لیے بیعت کر لی ہے اور نعمان بن بشیر کوفہ کے گورنر ان کے معاملہ میں نرم رویہ اختیار کر رہے ہیں

---

[1] کتاب مذکور ص۴۳

تو اس نے فوراً نعمان کو معزول کر دیا اور عبید اللہ ابن زیاد جو بصرہ کا گورنر تھا اسے کوفہ کا انتظام بھی سپرد کر دیا۔ عبید اللہ نے کوفہ پہنچ کر سخت پالیسی اختیار کی اور مسلم بن عقیل رضؓ کو قتل کرا دیا۔ مگر حضرت حسین رضؓ روانہ ہو چکے تھے۔ راہ میں قتلِ مسلم کی خلافِ توقع خبر ملی تو معلوم ہوا کہ حالات بالکل دگرگوں ہیں۔ پھر بھی آپ نے واپس ہونا مناسب خیال نہیں کیا یا آلِ عقیل نے واپس نہیں ہونے دیا۔ آخر عبید اللہ ابن زیاد کی فوج نے آپ کو گھیر لیا۔ آپ نے واپسی کا ارادہ فرمایا لیکن گورنر نے بغیر بیعت کئے واپسی کی اجازت نہیں دی۔ آخر ۱۰ محرم ۶۱ھ مطابق ستمبر ۶۸۱ء کو آپ مع اپنے اعزہ کے شہید کر دیئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اصلاحی اور تجدیدی کارنامے

(۱) حضرت حسین رضؓ نے اپنے علم و فضیلت، تقویٰ و طہارت کے، باوجود سیاست میں حصہ لیا بلکہ اپنا سر دے کر اسے صحیح رخ پر لانے کی کوشش کی۔ اس طرح آپ نے دین کے صحیح تصور کو قائم اور باقی رکھنے، زندہ اور تازہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ آپ کا پہلا کارنامہ ہے

(۲) آپ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ سیاسی پہلو میں شورائیت اور انتخاب کے بجائے جو نامزدگی اور ولی عہدی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اس کے خلاف آواز اٹھا کر اور تحریک چلا کر بلکہ اپنی اور اپنے خاندان کی قربانی دے کر یہ ثابت کر دیا کہ دین کے کسی پہلو میں بھی بدعت سر اٹھائے تو اسے کسی حال میں برداشت نہیں کرنا چاہیے۔

(۳) تیسرا کارنامہ آپ کا یہ ہے کہ اگرچہ رخصت کی راہ کھلی ہوئی تھی مگر آپ نے عزیمت کی راہ اختیار کر کے رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کے لیے سنگِ میل قائم کیا کہ اسلامی خلافت باقی رکھنے کے لیے اور اسے ملوکیت کی راہ پر جانے سے

روکنے کے لیے عزیمت کی راہ اپنانا چاہیے اور اپنا خون دے کر اسے صحیح صورت پر لانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

عزمِ راسخ

(۱) حضرت حسینؓ جب مدینہ سے مکہ جا رہے تھے تو عبداللہ بن مطیع نے آپ سے کہا تھا آپ کہیں بھی تشریف لے جائیے مگر کوفہ نہ جائیے گا کیونکہ اہل کوفہ نے آپ کے والد اور آپ کے بھائی دونوں کو دغا دی وہ آپ کے ساتھ بھی غدّاری کریں گے۔

(۲) جب مکہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ حضرت حسین کوفہ کا ارادہ کر رہے ہیں تو عمرو بن عبدالرحمٰن نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا اگر یہ خبر صحیح ہے تو میں سخت خطرہ محسوس کرتا ہوں آپ ایسی جگہ تشریف لے جا رہے ہیں جہاں دوسرے کی حکومت ہے۔ آپ کا یہ اقدام درست نہیں۔

(۳) عبداللہ بن عباس آئے اور کہا حسین! میں تم کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں اس ارادہ سے باز آجاؤ۔ اگر عراقیوں نے امیر شام کے مقرر کردہ گورنر کو وہاں سے نکال دیا ہے اور خود شہر پر قابض ہیں تو بے شک جاؤ لیکن اگر وہاں گورنر موجود ہے تو یقیناً بلانے والے تم کو دھوکہ دیں گے اور عین موقع پر تم کو چھوڑ بھاگیں گے بلکہ خود تمہارے مقابلہ پر آئیں گے۔

(۴) عبداللہ ابن زبیرؓ نے کہا۔ خدا کے لیے عراق نہ جائیے یہیں بیٹھ کر خلافت انجام دیجئے، ہم سب آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ آپ بیٹھے رہیے باقی سارے کام میں خود انجام دے لوں گا۔

(۵) حضرت عبداللہ بن عباس پھر آئے اور کہا تمہارے اس ارادہ سے میں سخت مضطرب ہوں عراقی بڑے فریبی ہوتے ہیں مجھے تمہاری ہلاکت نظر آرہی ہے۔ اگر یہاں رہنا نہیں چاہتے تو یمن چلے جاؤ وہاں تمہارے حمایتی بکثرت ہیں وہاں

مضبوط قلعے اور پہاڑیاں ہیں وہاں اطمینان سے بیٹھ کر چاروں طرف اپنے داعی بھیجو اور کار خلافت انجام دو۔ حضرت حسینؓ نے صرف اتنا کہا اب تو میں ارادہ کر چکا ہوں۔

(۶) ابو بکر ابن حارث نے بھی کوفیوں کی غدّاری یاد دلا کر اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

(۷) غرض کہ مذکورہ لوگوں کے علاوہ عبداللہ ابن عمرؓ، محمد بن حنفیہ، عبداللہ بن جعفرؓ، مدینہ کے گورنر عمرو بن سعیدؓ وغیرہ نے بھی آپ کو اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر آپ اپنے اٹل ارادہ پر قائم رہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے اس عزم راسخ کا راز کیا ہے؟ اور دوسرا سوال یہ ابھرتا ہے کہ آخر لوگوں نے آپ کو باز رکھنے کی کوشش کیوں کی؟

لوگوں کے باز رکھنے کی چند وجوہات ہو سکتی ہیں۔

(۱) آپ کا مقصد ہی غلط ہے، حکومت اسلامیہ نے کوئی غلط رُخ اختیار نہیں کیا ہے۔ آپ متقی اور پرہیز گار بزرگ ہیں، اللہ اللہ کیجیے، قرآن و حدیث کی اشاعت اور تبلیغ دین میں لگے رہیے، سیاست میں حصّہ لینا آپ کے لیے زیب نہیں دیتا۔

مگر جن بزرگوں نے بھی اس عزم سے باز رکھنے کی کوشش کی کسی نے بھی آپ کے مقصد کو غلط نہیں کہا۔ اوپر دیے ہوئے اقتباسات[1] اور تمام قدیم و جدید معتبر تاریخی کتابیں اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کرتیں۔

(۲) اکثریت نے چونکہ یزید کو خلیفہ تسلیم کر لیا ہے لہٰذا اس کے خلاف خروج درست نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کی یہ رائے رہی ہو اور اس میں وزن بھی

---

[1] ماخوذ از "دس بڑے مسلمان"

محسوس ہوتا ہے لیکن اول تو اکثریت نے برضا و رغبت بیعت نہیں کی تھی دوسرے یہ رخصت کی راہ تو تھی مگر عزیمت کی راہ نہیں تھی۔ ورنہ کسی بھی ظالمانہ اور قاہرانہ اقتدار کے خلاف کبھی بھی آواز نہیں اٹھائی جا سکتی۔

(۳) کام تو درست ہے لیکن کامیابی ناممکن ہے لہٰذا بے نتیجہ اور پُرخطر کام سے باز رہنا ہی بہتر ہے۔ لیکن ہر بڑا کام پُرخطر ہوتا ہے۔ رہی کامیابی اور ناکامی تو ہو سکتا ہے حضرت حسینؓ نے اندازہ کرنے میں غلطی کی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ باز رکھنے کی کوشش کرنے والوں کی رائے غلط ہو۔ صحت اور غلطی کا امکان دونوں طرف ہے۔

رہا پہلا سوال کہ آپ کے اس اٹل فیصلے اور عزم راسخ کا راز کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ احساس فرض اور احیاء خلافت راشدہ کا بے پناہ جذبہ تھا جس نے آپ کے اندر عزم و ارادہ کی بے نظیر قوت بھر دی تھی۔ سیاست و مذہب کی تفریق آخر آپ کس طرح برداشت کر سکتے تھے؟ کیا دین کے اس تصور سے جو حضورؐ نے پیش کیا تھا آپ واقف نہ تھے؟ لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر صرف اتنا فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک کام کا حکم دیا ہے۔ میں اپنی جان قربان کر کے بھی ان کے حکم کو بجا لاؤں گا۔ (دس بڑے مسلمان ص۲۴۸ بحوالہ تاریخ طبری)

پھر کس طرح اس تصور کی پامالی کو آپ ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیتے۔ خلافت راشدہ کو قیصر و کسریٰ کی ڈگر پر چلنے کے لیے آزاد چھوڑ دینے کے مقابلے میں اپنی اور خاندان کی قربانی ان کے نزدیک آسان تھی جب کہ اہل عراق ہزارہا کوفی اور بصری خود ان کو دعوت دے رہے تھے، جب کہ انھوں نے حضرت مسلم بن عقیل کو بھیج کر اور ان کی رپورٹ حاصل کر کے پورا اطمینان بھی کر لیا تھا۔

حضرت حسینؓ کی سیرت ایک اولوالعزم اور بلند ہمت انسان، ایک سچا اور پاکباز، متقی اور پرہیزگار انسان، حدیہ کہ ایسا

انسان جس کا مقصود دنیا نہیں آخرت ہو، جو حُبِّ دنیا کا رسیا نہیں، خدا رسیدہ ہو، جس کا نصب العین، دنیوی عروج و اقتدار، عزت و شہرت نہیں بلکہ خوشنودیِ رب اور رضائے باری تعالیٰ ہو وہ آخر کسی گھٹیا اور پست مقصد کے لیے قدم کس طرح اٹھا سکتا ہے؟ اسی طرح دنیا کا حریص اور حُبِّ دنیا میں لت پت آدمی کوئی بڑی قربانی کسی عظیم مقصد کے لیے کبھی پیش نہیں کر سکتا۔ غرض کہ انسان کی سیرت، اس کی زندگی اور کردار وہ کسوٹی ہے جس کے ذریعہ اس کی نیت کا کھوٹ اور کھرا پن آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ معیار ہے جس سے اس کا خلوص اور للّٰہیت بخوبی جانچی جا سکتی ہے۔ آیئے دیکھیں کہ حضرت حسین رضؓ کتنی عظیم سیرت کے انسان تھے۔ ابن اثیر لکھتے ہیں حسین رضؓ علم الٰہی کے بڑے فاضل تھے (اسد الغابہ۔ وہ مزید لکھتے ہیں۔

کان الحسین رضؓ کثیر الصّلوٰۃ و الصّوم وَ الحجّ والصّدقۃِ و افعال الخیر جمیعھا۔	حضرت حسین رضؓ نماز، روزہ، حج اور صدقات اور تمام نیکی اور بھلائیوں کے کام کثرت سے انجام دیتے تھے۔

(بحوالہ دس بڑے انسان)

آپ انتہائی فیاض تھے کثرت سے صدقہ و خیرات کرتے تھے۔ لوگوں کو ان کے حوصلے سے زیادہ دیتے۔ کبھی کسی سائل کو خالی واپس نہ جانے دیتے۔ ایک بار ایک ضرورت مند آپ کے پاس آیا فوراً دو سو درہم اسے دے دیے حالانکہ آپ کے پاس صرف یہی رقم تھی۔ اتنا بھی آپ کے پاس نہ رہا کہ جس سے رات کے کھانے کا انتظام ہو جاتا۔ حضرت اسامہ بن زید رضؓ جب بیمار پڑے اور سمجھے کہ اب میرا آخری وقت ہے تو فرمانے لگے مجھ پر ساٹھ ہزار کا قرض ہے ادا ہو جاتا تو نزاع کی تکلیف میں آسانی ہوتی۔ حضرت حسین رضؓ نے سنا تو فوراً گھر تشریف لے گئے اور سارا قرض ادا

کر دیا۔

حضرت حسین رضؓ کی سیرت غیر معمولی قوۃ ضمیر کی، اور مثالی جوہرایمان کی مالک تھی دور معاویہ رضؓ میں یزید کی ولی عہدی کے مطالبہ پر آپ کے انکار سے لے کر میدان کربلا میں واقعہ شہادت تک کے تمام واقعات میں آپ کا ضمیر اور ایمان بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہی واقعات یہ بتاتے ہیں کہ آپ کے اندر بے پناہ قوتِ عمل موجود تھی اور آپ غیر معمولی دماغی توازن سے بھی آراستہ تھے۔ مدینہ سے مکہ اور پھر وہاں سے کوفہ جاتے ہوئے ہر جگہ آپ کو حوصلہ شکن حالات سے دوچار ہونا پڑا، آپ کو حوصلہ بڑھانے والے کم میسر آئے لیکن مخالف تو خیر مخالف تھے ہی، آپ کے موقف کی تائید کرنے والے بھی ہمت افزائی کے بجائے آپ کو آپ کے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور کوفہ والوں کی غدّاریوں کے پیش نظر حالات کے پر خطر اور نازک ہونے کی وجہ سے آپ کو کوفہ کے بجائے کسی اور طرف رُخ کرنے کو کہتے ہیں لیکن آپ جب ایک بار فیصلہ کر چکے تو پھر ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ اپنی اور اپنے خاندان کی موت جب سر پر کھڑی نظر آنے لگتی ہے تب بھی آپ کے ارادہ میں ذرا اضمحلال بھی محسوس نہیں ہوتا ذرا بھی آپ کے قدموں میں ڈگمگاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ عزم واستقامت کا پہاڑ آپ کی سیرت میں مضمر تھا، اپنے موقف کی صداقت پر آپ کو اذعان حاصل تھا۔ یزید کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ اس مسیبت عظمیٰ سے چھٹکارا حاصل کر سکتے تھے جس میں کربلا پہنچ کر مبتلا ہو گئے تھے لیکن اس طرح آپ کا مشن یعنی صحیح تصورِ دین کا احیاء خلافت راشدہ کی تجدید اور ملوکیت کا استیصال یقیناً متاثر بلکہ پامال ہو جاتا۔ آپ کی اعلیٰ سیرت وکردار اور بہترین کیرکٹر آخر اسے کیسے گوارا کر سکتا تھا۔

اقوالِ زرّیں کسی انسان کی سیرت کا اندازہ اس کے عمل اور قول دونوں ہی سے کیا جاتا ہے۔ عمل سے آپ کی بلند اور اعلیٰ سیرت ہمارے سامنے ہے۔ کچھ اقوالِ زرّیں ملاحظہ فرمائیے۔ مصنف[۱] حسین ابن علیؓ نے تاریخ کبیر، الحسین، کشف الغمۃ، ابن عساکر، تاریخ الملوک ابن جریر طبری، ریاض الجنان اور اسرار الحکماء وغیرہ کتابوں کے حوالوں سے یہ اقوال درج کیے ہیں۔

(۱) خدا کے پاس ایک ایسا رجسٹر ہے جس میں چھوٹا بڑا کوئی گناہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) (امیر معاویہؓ کو خطاب کر کے) اپنے بیٹے کے لیے تمہاری یہ بیعت اور اس کے لیے مواخذہ ہرگز نظر انداز نہیں ہو سکتا۔

(۳) بہترین سکون یہ ہے کہ خدا کی اطاعت پر خوش رہو۔

(۴) حلم اور بردباری انسانی سیرت کو آراستہ کرتی ہے۔

(۵) حرص اور کثرت طلبی صرف بُری ہی نہیں مہلک بھی ہے۔

(۶) عظمت و بزرگی کا بہترین ذریعہ سخاوت اور نیک عمل ہے۔

(۷) اچھا عمل خود بخود تعریف کا مستحق بنا دیتا ہے۔

(۸) دنیا کو خدا نے آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے۔

(۹) امام اس وقت تک امام نہیں ہے جب تک کتاب اللہ پر عامل نہ ہو، عدل نہ کرے، انصاف اور دیانت سے کام نہ لے اور خدا پر اعتماد نہ رکھتا ہو۔

(۱۰) بدترین حاکم وہ ہے جو اپنے مخالفوں کے سامنے بزدل ثابت ہو اور نامردی دکھائے اور کمزوروں کے سامنے جرأت کا مظاہرہ کرے۔

---

[۱] نکہت شاہجہاں پوری۔

(۱۱) بہترین مال وہ ہے جس سے عزت و آبرو کو محفوظ رکھا جائے۔
(۱۲) اگر زمانہ تیرے ٹکڑے بھی اڑا دے پھر بھی تو مخلوق کی طرف مائل نہ ہو۔
(۱۳) ذلت برداشت کرنے سے موت بہتر ہے۔
(۱۴) اگر جسموں کے لیے موت ہی مقدر ہے تو انسانوں کو راہِ خدا میں شہید ہونا بہتر ہے۔
(۱۵) جو شخص اپنے مسلک کو قیاس کی ترازو میں تولتا ہے وہ شکوک و شبہات میں گرفتار رہتا ہے۔

غرض کہ حضرت حسینؓ کی زندگی اس شعر کا مصداق ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ

ایک مصلح اور مجدّد

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے نام کے ساتھ مصلح اور مجددؒ کا لفظ دیکھ کر بعض لوگ چونکیں گے، عجب نہیں کہ کچھ لوگ ناک بھوں چڑھائیں۔ لیکن میرے نزدیک دین کے سیاسی رُخ کے صرف ایک پہلو میں بدعت نے سر اٹھایا تھا اور اسی کی اصلاح و تجدید کا بیڑا حضرت حسین ابن علیؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے اٹھایا تھا۔

محرم ۶۱ھ میں حضرت حسینؓ شہید ہو گئے۔ آپ کے بعد آپ کے مشن کو لے کر اٹھنے والے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ ہی تھے۔ آپ نے یزید کے عہد میں بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں لیکن ۶۴ھ میں جب یزید فوت ہو گیا تو اس کے بعد سے لے کر ۹ برس تک آپ نے فتنۂ مختار خوارج کی شورش اور بنو امیہ کے استبداد کا لگاتار مقابلہ کیا اور احیاء خلافت راشدہ کی تحریک کو بہت آگے تک بڑھائے جانے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی۔

تعارف آپ کا نام عبداللہ آپ کے والد کا نام حضرت زبیرؓ ابن عوام ہے۔ آپ کے دادا عوام ابن خویلد اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ بہن بھائی تھے۔

آپ کے والد حضرت زبیر حضرت صفیہؓ کے بیٹے تھے جو حضورؐ کی پھوپھی تھیں۔ اس طرح آپ کے والد حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ آپ کی والدہ حضرت اسماءؓ حضرت ابوبکر صدیق کی صاحبزادی تھیں۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ آپ کی خالہ تھیں۔ غرض کہ آپ خاندان نبوت ہی کے چشم و چراغ تھے۔

ہجرت کے بعد بہت دنوں تک کسی مہاجر کے اولاد نہیں ہوئی تو یہودیوں نے افواہ پھیلائی کہ ہم نے مسلمانوں کے انقطاع نسل کے لیے جادو کر دیا ہے۔ اسی دوران ۱ھ میں عبداللہ ابن زبیر پیدا ہوئے۔ اس طرح یہودیوں کے اوہام کی تردید ہو گئی۔ آپ کی پیدائش کی خبر سے مسلمانوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

آپ کے نانا حضرت ابوبکرؓ کے نام پر آپ کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ حضورؐ نے آپ کو گود میں لیا اور ایک کھجور چبا کر اپنا لعاب دہن آپ کے منہ میں ڈالا۔ آپ کی خالہ حضرت عائشہؓ کی شادی حضورؐ سے ہوئی تھی مگر ان کے اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ اپنے بھانجے عبداللہ کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی اور رکھتی تھیں۔ اس طرح آپ کی پرورش اور پرداخت اور تعلیم و تربیت، حضورؐ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت اسماءؓ کے گھر اور انھیں حضرات کی گودوں میں ہوئی۔

آپ نے قرآن حفظ کیا، دین کی حکمت اور اس کا علم حاصل کیا۔ حدیثیں سنیں اور یاد کیں اور ان میں سوجھ بوجھ پیدا کی۔ آپ لمبی نمازیں پڑھتے اور بڑے اہتمام سے روزے رکھتے۔ آپ عبادات کے بڑے شوقین تھے۔

شوق جہاد اور فتح طرابلس

آپ کو جہاد کا شوق تھا چنانچہ اپنے والد کے ہمراہ جنگ یرموک میں شریک ہوئے اور ۲۷ھ میں جب افریقہ کے میدان جہاد کی خبریں آنا بند ہو گئیں تو خلیفہ وقت حضرت عثمانؓ کو تشویش لاحق ہوئی۔ حضرت عثمانؓ نے عبداللہ ابن زبیرؓ کو بھیجا تا کہ میدان جہاد

اور مجاہدین کی خیریت معلوم کریں اور اس سے مرکز خلافت کو مطلع کریں چنانچہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ میدان جہاد میں پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ روزانہ مقابلہ ہوتا ہے اور دونوں فریق دن بھر برسر پیکار رہنے کے بعد اپنے اپنے پڑاؤ پر واپس ہو جاتے ہیں مسلم مجاہدین جان توڑ کوشش کرتے ہیں لیکن دشمن قابو میں نہیں آتا۔

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے مشورہ دیا مسلمانوں کا لشکر دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے ایک حصہ دشمن سے لڑے اور دوسرا آرام کرے اور پھر جب دشمن تھک کر چور ہو جائے تو اس پر حملہ آور ہو کر اسے شکست کھانے پر مجبور کر دے۔

ابن ابی سرح نے لشکر کی قیادت عبداللہ ابن زبیرؓ کے سپرد کر دی کہ وہ اپنی تجویز پر خود عمل پیرا ہوں چنانچہ آپ نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ایک حصے کے ساتھ ساتھ دشمن سے نبرد آزما ہوئے۔ جب دشمن کی فوج تھک کر چور ہو گئی تو اپنی فوج کے دوسرے حصہ کو حملہ کا حکم دیا۔ اس ترکیب سے دشمن کو شکست فاش ہوئی اور اس کا سپہ سالار جرجیر مارا گیا۔ کثیر مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا[1]۔ غرض کہ طرابلس آپ کی کوششوں سے فتح ہوا۔

آپ نے ۳۰ھ میں فتح طبرستان کی مہم میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا[2]۔ ۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ پر باغیوں نے یورش کی اور آپ کے مکان کو گھیر لیا۔ اس موقع پر آپ کی حفاظت کرنے والے حضرت حسینؓ کے علاوہ ایک عبداللہ ابن زبیرؓ بھی تھے۔

جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ کی حمایت میں پیش پیش رہے بلکہ ان کی حفاظت کرتے ہوئے اس قدر زخم کھائے کہ پورا جسم چھلنی ہو گیا۔

---

[1] مشاہیر اسلام صفحہ ۲۸۲۔ [2] ابن کثیر بحوالہ سیر الصحابہ صفحہ ۲۵۰

ملوکیت کے آگے بند امیر معاویہ رضؓ کے عہد میں یزید کی ولی عہدی کے مطالبہ پر انتہائی صحیح موقف اختیار فرمایا اور کہا کہ اس سلسلہ میں تین ہی موقف ہو سکتے ہیں۔

(۱) ایک وہ جو رسول اللہ صلعم نے اختیار فرمایا کہ کسی کو نامزد نہیں کیا بلکہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا کہ جس کسی کو باصلاحیت اور صالح ترین پائیں خود منتخب کر لیں۔

(۲) دوسرا موقف وہ جو حضرت ابوبکر رضؓ نے اختیار فرمایا کہ مسلمانوں کے نمائندوں اور سربرآوردہ لوگوں سے مشورہ کے بعد ایک ایسے شخص کو نامزد فرمایا جو ان کے خاندان بنو تیم میں سے نہیں بلکہ بنو عدی میں سے تھا۔

(۳) تیسرا وہ جو حضرت عمر رضؓ نے اختیار فرمایا کہ مسلمانوں کے چند چیدہ حضرات کے سپرد کر دیا کہ وہ اپنے اندر سے جس کو چاہیں منتخب کر لیں۔

اور جب امیر معاویہ رضؓ نے ان تینوں میں سے ایک طریقہ بھی منظور نہیں کیا اور یزید کی ولی عہدی تسلیم کرنے پر اصرار کیا تو اگرچہ آپ کو جان کا بھی خطرہ درپیش تھا اس کے باوجود آپ نے یزید کی ولی عہدی کو تسلیم نہیں کیا جسے وہ اسلام کے خلاف شمار کرتے تھے، اسلامی خلافت کو ملوکیت کی طرف موڑنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس طرح حضرت عبداللہ ابن زبیر رضؓ نے ہزار خطرے مول لے کر اول مرحلہ میں ہی ملوکیت پر ضرب لگائی۔ یہ ان کا پہلا کارنامہ ہے۔ یہ کارنامہ انھوں نے تنہا انجام نہیں دیا۔ ان کے علاوہ حضرت حسین ابن علی رضؓ، حضرت عبداللہ ابن عمر رضؓ، حضرت عبدالرحمٰن ابن ابوبکر رضؓ وغیرہ نے بھی یہی موقف اختیار فرمایا تھا۔ یہ حضرات تو لیڈر تھے ان کے ساتھ اہل مدینہ بلکہ اہل حجاز تھے مگر عام پبلک حکومت کے آگے بے بس تھی۔

یزید ۶۰ھ میں اپنے والد حضرت امیر معاویہ رضؓ کے انتقال کے بعد جب تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے حضرت حسین رضؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضؓ سے بیعت

لینے کا تاکیدی حکم دیا۔ مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ نے ان دونوں حضرات کو بلایا تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ مہلت لے کر راتوں رات مکہ تشریف لے گئے اور حرم میں جا کر پناہ گزین ہو گئے۔ حضرت حسینؓ جب کوفہ روانہ ہونے لگے تو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اگرچہ خلافت کو خلافت راشدہ بنانے اور ملوکیت کے آگے بند باندھنے کے مقصد میں ان کے ہم رائے اور حامی تھے مگر کوفہ والوں کے بھروسہ پر کوفہ سے اس کام کا آغاز کرنے سے آپ ہرگز متفق نہ تھے۔ چنانچہ آپ نے حضرت حسینؓ سے فرمایا، آپ مکہ ہی میں قیام کر کے خلافت کی کوشش کیجئے۔ ہم سب آپ کی امداد کریں گے[1]

اہل حجاز نے یزید کی ولی عہدی اور خلافت، خوش دلی سے نہیں بلکہ فوجی دباؤ سے قبول کی تھی۔ کربلا میں حضرت حسینؓ اور ان کے خاندان کی مظلومانہ شہادت نے ان کو زیادہ متاثر کیا حتیٰ کہ انھوں نے یزید کی بیعت توڑ دی اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ عبداللہ ابن زبیرؓ تو خود ہی ایسے موقع کے انتظار میں تھے جس میں خلافت راشدہ کا احیاء کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے بیعت لے لی اور اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح جنگ موتہ میں خالد ابن ولیدؓ نے آگے بڑھ کر فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور بہادری کے جوہر دکھا کر اپنی فوج کو محفوظ نکال لائے تھے۔!

یزید کو خود ہی ان کی طرف سے خطرہ تھا۔ لہٰذا واقعۂ کربلا کے ہی بعد اس نے آپ کے پاس چند حکام بیعت لینے کی غرض سے بھیجے اور انکار کرنے کی صورت میں گرفتاری کا حکم دیا۔ چنانچہ یزید کے فرستادے آپ کے پاس پہنچے

---

[1] تاریخ اسلام دوم دار المصنفین صفحہ ۵۱

توآپ نے کہا، میں یزید کی کوئی بات نہیں مانوں گا۔[۱] یزید نے طرح طرح سے ترغیب وترہیب سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ذرا نرم نہ پڑے۔ عبداللہ ابن عباس اور محمد بن حنفیہ رض کے علاوہ تمام اہل حجاز نے انھیں خلیفہ تسلیم کرلیا اور اموی عملا کو نکال دیا۔ اہل مدینہ نے حضرت عبداللہ ابن حنظلہ رض کو اپنا عامل منتخب کر کے عبداللہ ابن زبیر رض کو خلیفہ تسلیم کرلیا۔

یزید نے اس انقلاب کی خبر سُن کر مسلم بن عقبہ کو دس ہزار فوج دے کر بھیجا۔ مسلم نے اہل مدینہ کو یزید کی ہدایت کے مطابق پہلے اطاعت کی دعوت دی۔ اہل مدینہ نے انکار کیا تب اس نے جنگ کی۔ اہل مدینہ نے پامردی کے ساتھ مدافعت کی مگر شکست کھائی۔ شامی فوج نے تین دن تک مدینہ کو لوٹا اور قتل عام جاری رکھا۔ مدینہ گویا تباہ ہوگیا۔ باقی ماندہ لوگوں نے بیعت کرلی مسلم بن عقبہ مدینہ کو تاراج کر کے مکہ روانہ ہوا۔ چونکہ عرصے سے بیمار تھا لہٰذا راستہ ہی میں فوت ہوگیا۔ اس کا قائم مقام حصین بن نمیر مکہ پہنچا اور حضرت عبداللہ بن زبیر رض کا محاصرہ کرلیا۔ یہ ۶۴ھ کا واقعہ ہے۔ محاصرہ ابھی جاری تھا کہ یزید کا انتقال ہوگیا۔ یہ خبر جب مکہ پہنچی تو حصین نے محاصرہ اٹھا لیا اور عبداللہ ابن زبیر رض سے کہا آپ میرے ہمراہ شام چلیے۔ آپ سے زیادہ خلافت کا مستحق کوئی نظر نہیں آتا ہے میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہوں۔ مگر عبداللہ ابن زبیر رض نے سختی سے انکار کیا چنانچہ حصین واپس شام چلا گیا۔

یزید کے بعد اس کا نوجوان بیٹا معاویہ ثانی جس کی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی منتخب ہوا جو دیندار اور صالح تھا۔ تین ماہ بعد وہ خلافت سے دستبردار

---

[۱] اخبار الطوال بحوالہ کتاب مذکور صفحہ ۶۰

ہو گیا۔ طبری نے اس کی تقریر نقل کی ہے۔ "مجھ میں حکومت کا بارِ اٹھانے کی طاقت نہیں ہے میں نے چاہا تھا کہ حضرت ابو بکرؓ کی طرح کسی کو اپنا جانشین بنا دوں یا حضرت عمرؓ کی طرح چھ آدمیوں کو نامزد کر کے ان میں سے کسی کا انتخاب شوریٰ پر چھوڑ دوں لیکن نہ حضرت عمرؓ جیسا کوئی نظر آیا اور نہ ویسے چھ آدمی ملے اس لیے میں اس منصب سے دستبردار ہوتا ہوں تم لوگ جسے چاہو خلیفہ بنا لو"[1]

اس طرح معاویہ بن یزید نے اپنے عمل سے اس موقف کی گویا تائید کی جو اس کے باپ دادا کا نہیں بلکہ حسین ابن علیؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ کا موقف تھا کہ خلافت شورائی اور جمہوری ہے، خاندانی اور شخصی نہیں ہے۔

یزید کی وفات کے بعد اہل مدینہ نے پھر ابن زبیرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور چونکہ آپ کی شخصیت ہر لحاظ سے خلافت کی مستحق تھی اور بنو امیہ میں بھی کوئی حوصلہ مند نظاہر نہیں تھا، لہٰذا، حجاز، عراق، شام اور مصر سب نے آپ کی خلافت تسلیم کر لی اور ہر جگہ ان کے مقرر کردہ حکام نے انتظام سنبھال لیا۔ شام میں صرف اردن کے والی حسان بن بحدل نے آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ اس طرح حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کل دنیائے اسلام کے خلیفہ ہو گئے۔

واقعہ حرّہ (مدینہ کی لوٹ) کے بعد بنو امیہ جن کو اہل مدینہ نے نکال دیا تھا پھر واپس مدینہ آ گئے تھے۔ حتیٰ کہ مروان اور عبدالملک بھی مدینہ ہی میں تھے۔ عبداللہ ابن زبیرؓ سے ایک بڑی سیاسی چوک یہ ہوئی کہ بنو امیہ کو مدینہ سے

---

[1] کتاب مذکور صفحہ ۶۹

نکال دیا۔ مروان اور عبدالملک کو بھی نکلنا پڑا۔

مروان شام پہنچا وہاں بڑا اختلاف اور انتشار تھا۔ آخر کار جابیہ میں بنوامیہ کے حامیوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں بڑی ردوکد کے بعد مروان کو خلیفہ چن لیا گیا۔ اس طرح عبداللہ ابن زبیرؓ کی اپنی غلطی سے ان کا ایک زبردست حریف پیدا ہو گیا، اور مرج راہط کی فیصلہ کن جنگ میں ابن زبیرؓ کے حامیوں کو زبردست شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح شام آپ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد ہی مروان نے فوج کشی کا حکم دیا اور بغیر معرکہ آرائی کے مصر اس کے قبضہ میں آگیا اور پھر فوراً ہی اس نے عبیداللہ ابن زیاد کو عراق روانہ کیا۔ صرف نو ماہ خلیفہ رہ کر اور بنوامیہ کی حکومت کی دوبارہ داغ بیل ڈال کر مروان نے اچانک رمضان ۶۵ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا عبدالملک تخت پر بیٹھا۔

فتنۂ مختار مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کا فتنہ واقعی ایک عظیم فتنہ تھا اور اس کا فرو کرنا عبداللہ بن زبیرؓ کا ایک کارنامہ ہے۔ لہٰذا اس کا ذرا تفصیلی تعارف ضروری ہے۔

۶۶ھ میں حکومت و اقتدار کی ہوس لیے ہوئے ابو عبیدہ ثقفیؒ کا بیٹا مختار خونِ حسینؓ کا دعویٰ لے کر اٹھا اور عراق پر قابض ہو گیا۔ یہ ایک بے دین مگر شاطر آدمی طوائف الملوکی کی فضا نے اس میں قسمت آزمائی کا حوصلہ پیدا کیا۔

حضرت حسینؓ کے خون کا مطالبہ عام لوگوں کے لیے بڑی کشش رکھتا تھا۔ لہٰذا اس نے اس مطالبہ کو ایک کامیاب ہتھکنڈے کے طور پر اختیار کیا اور عملاً قاتلینِ حسینؓ کو قتل کر کے اس کارنامہ کا سہرا بھی اپنے سر باندھ لیا۔

پہلے تو یہ شخص عبداللہ ابن زبیرؓ سے ملا اور خاصا رسوخ حاصل کر لیا

لیکن یہاں اسے اپنی ہوس اقتدار پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آئی لہٰذا توابین[1] کی تحریک میں شامل ہو گیا بلکہ عبیداللہ بن زیاد کے ہاتھوں توابین کی تباہی کے بعد خود ان کا رہنما بن گیا لیکن اپنی شاطرانہ فطرت کی وجہ سے عبداللہ ابن زبیرؓ سے تعلق باقی رکھا اور اپنی تحریک کو موثر بنانے کے لیے زین العابدینؒ ابن حسینؓ کو اپنا سرپرست ظاہر کیا لیکن حضرت زین العابدینؒ نے مسجد میں تقریر کی اور اس کے مکر و فریب کا پردہ چاک کیا اور فرمایا کہ اس شخص نے محض دھوکہ دہی کے لیے اہل بیت کی دعوت کو آڑ بنایا ہے! دھر سے مایوسی کے بعد اس نے حضرت محمد بن حنفیہؒ پر ڈورے ڈالنا شروع کیے اور ان کی طرف سے فرضی خط شائع کر کے لوگوں کو دھوکہ دیا اور ان کو وصی اور مہدی ظاہر کیا۔ اپنے متعلق نزول وحی کا دعویٰ کیا۔ خدائے تعالیٰ سے غلطی کے امکان کا عقیدہ ایجاد کیا۔ ایک کرسی کو حضرت علیؓ کی کرسی قرار دے کر اسے بنی اسرائیل کے تابوت سکینہ کی طرح مقدس اور فتح و ظفر کا ذریعہ قرار دیا۔

کوفہ چونکہ شیعیان علیؓ کا مرکز تھا۔ شہادت حسینؓ کا واقعہ یہیں (کربلا) میں پیش آچکا تھا۔ توابین کی تحریک کا مرکز بھی یہیں تھا۔ لہٰذا مختار کی تحریک نے زور باندھا حتیٰ کہ اس کی ذات شیعیانِ علیؓ کا مرکز بن گئی۔ پورے عراق پر مختار کا

---

[1] یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے پہلے تو ایڑی چوٹی کا زور صرف کر کے حضرت حسینؓ کو کوفہ بلایا۔ حضرت مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر حضرت حسینؓ کی بیعت کی۔ لیکن جب حکومت کے تیور بگڑے تو یہ محبان اہل بیت اور شیعیان حضرت علیؓ حضرت مسلم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ حتیٰ کہ یہی کوفی تھے جنھوں نے حضرت حسینؓ اور ان کے خاندان کو کربلا میں تہہ تیغ کرا دیا۔ اب یہی لوگ توابین کے نام سے خون حسینؓ کا بدلہ لینے اٹھے تھے۔

قبضہ تھا۔ صرف بصرہ عبداللہ ابن زبیرؓ کے قبضہ میں تھا جہاں ان کی طرف سے ان کے بھائی مصعب ابن زبیرؓ حاکم تھے۔ مصعب اور مختار میں کئی معرکے ہوئے آخر مختار نے شکست کھائی اور قتل ہوا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں نہ معلوم کس نفسیاتی فضا میں اپنی ذہنیت کا اظہار کیا، میری عمر کی قسم یہ سب محض حصول دنیا کے لیے تھا۔ میں نے دیکھا کہ شام عبدالملک کے پاس ہے، حجاز عبداللہ ابن زبیرؓ کے قبضہ میں ہے، بصرہ مصعب کے زیر حکومت ہے، عروض پر نجدہ حروری قابض ہے اور خراسان پر عبداللہ حازم کا تسلط ہے اور میرے حصے میں کچھ بھی نہیں۔ اس لیے میں نے بھی قسمت آزمائی کی لیکن خونِ حسینؓ کے انتقام کی دعوت کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کو حصولِ مقصد کا آلہ بنایا۔[1]

یہ مختار ثقفی کا فتنہ ہے جو ہوس اقتدار میں دین کے نام سے بے دینی پھیلا رہا تھا۔ اگر خدانخواستہ اس کو کچھ طویل مدّت کے لیے اقتدار مل جاتا تو وہ دین کے بجائے بے دینی کو غالب کر کے چھوڑتا۔ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے بھائی مصعب ابن زبیرؓ کے ذریعہ اس کے اقتدار کو پامال کر دیا اور اسے قتل کرا کے مسلمانوں کو اس سے نجات دلائی۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزا۔

فتنۂ خوارج حضرت عثمانؓ ۲۳ھ میں خلیفہ منتخب ہوئے اور ۳۵ھ میں شہید کر دیے گئے۔ کامل بارہ برس آپ نے کار خلافت انجام دیا۔ ابتدائی چھ برس میں تو فاروقی شان اپنا جلوہ دکھاتی رہی لیکن رفتہ رفتہ ملوکیت کے جراثیم پیدا ہونا، ابھرنا اور متعدد ہونا شروع ہوئے اور دوسرے چھ سال میں وہ امن وامان برقرار نہ رہ سکا تاہم حضرت عثمانؓ نے اپنی جان دے کر

---

[1] اخبار الطوال بحوالہ کتاب مذکور صفحہ ۸۶

ملوکیت کی رَو کو روکنا چاہا مگر اس کے جراثیم برابر پھیلتے رہے۔ ۳۵ھ میں جب حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو ملوکیت اچھے خاصے پاؤں پھیلا چکی تھی۔ حضرت علیؓ پورے پانچ برس خلافت راشدہ کو ملوکیت سے بچانے میں مصروف رہے۔ خلافت اور ملوکیت کی اس کشمکش کا ایک شاخسانہ جنگِ صفین ہے جس میں تحکیم کا واقعہ پیش آیا پھر اس کے بطن سے خوارج نمودار ہوئے۔

صفین کے میدان میں گھمسان کی لڑائی جاری تھی کہ اچانک امیر معاویہؓ کی طرف سے نیزوں پر قرآن مجید بلند کیے گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شامی فوج قرآن کی پناہ چاہتی ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنی فوج کو بہت سمجھایا کہ ایک جنگی چال ہے تم لڑائی جاری رکھو۔ قریب ہے کہ تمہارے مقابل کے پیر اکھڑ جائیں گے اور میدان تمہارے ہاتھ رہے گا۔ لیکن حضرت علیؓ کی فوج میں وہ شر انگیز عنصر نہ صرف شامل تھا بلکہ خاصہ غلبہ رکھتا تھا جس نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں لوٹ مچایا اور انتشار پیدا کیا تھا حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا تھا اس فتنہ پرور گروہ نے حضرت علیؓ کی منشا اور اجازت کے بغیر ہتھیار ڈال دیے اور اس طرح فریقِ ثانی اپنی جنگی چال میں کامیاب ہو گیا اور شکست سے محفوظ رہا۔

آخر کار دونوں فریق صلح پر آمادہ ہو گئے۔ دونوں نے ایک ایک نمائندہ منتخب کیا اور طے کیا کہ یہ دونوں نمائندے قرآن کے پیش نظر جو بھی فیصلہ کریں گے وہ ہم دونوں فریق کو تسلیم ہو گا۔ اس دوران اسی شر انگیز فتنہ جو اور فتنہ پرور گروہ نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ حضرت علیؓ سے کہا قرآن تو کہتا ہے "اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ حکم اور فیصلہ تو صرف اللہ کا ماننا چاہیے اور آپ نے انسانوں کو حکم (پنچ ثالث) تسلیم کر کے گناہ کبیرہ کیا ہے۔ لہٰذا آپ توبہ کریں اور اس ثالثی نامہ سے باز آ جائیں، ورنہ ہم آپ کی بیعت توڑ دیں گے اور آپ سے مقابلہ

کریں گے۔ حضرت علیؓ نے ان سے کہا تم بات تو ٹھیک کہتے ہو کہ حکم اللہ کا لیکن اس کا مطلب غلط لیتے ہو۔ بہرحال بارہ ہزار کی تعداد میں یہ لوگ حضرت علیؓ سے باغی ہو گئے۔ یہی لوگ خارجی کہلائے۔

آخر نہروان کے مقام پر ان لوگوں اور حضرت علیؓ کے درمیان جنگ ہوئی جس میں حضرت علیؓ غالب رہے اور خارجی پامال اور منتشر ہو گئے۔ پھر ان لوگوں نے ایک مستقل گروہ کی شکل اختیار کرلی اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد یہ لوگ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیشہ سر اٹھاتے رہے اور مسلمانوں کا خون بہاتے رہے۔ ان کا ایک مستقل مذہب ہو گیا۔

- ان کا نعرہ تھا اِنِ الحُکمُ اِلّا للہ۔ فیصلہ اور قانون صرف اللہ کا ماننا چاہیے۔
- ان کا نمایاں عقیدہ تھا گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے لہٰذا ایسے لوگوں سے جنگ اور جہاد کرنا فرض ہے اور ان کا خون اور مال سب مباح ہو جاتا ہے۔
- ان کا طریق کار توڑ پھوڑ، قتل و غارتگری اور خونریزی اور لوٹ مار کا طریقہ تھا۔ یہ لوگ ایک طرف تو نماز روزے کے سخت پابند ہوتے تھے اور دوسری طرف ان کے ہاتھ ہمیشہ مسلمان نوجوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کے خون سے تر رہتے تھے۔ حضرت علیؓ کے بعد خارجی حضرت معاویہؓ کے لیے بھی دردِ سر بنے رہے۔

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے جب خارجیوں کے عقائد سے بیزاری کا اعلان کیا تو وہ ان کے مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ خارجیوں کے نزدیک حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ سب کے سب گمراہ تھے (معاذ اللہ) لیکن عبداللہ ابن زبیرؓ

نے ان کے ان باطل خیالات کو تسلیم نہیں کیا بہر حال خارجی عبداللہ ابن زبیرؓ کے عہد میں بھی مسلمانوں کا خون بہانے اور ملّی طاقت پامال کرنے میں مصروف تھے۔

ان کے اس فتنہ کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی ایک جگہ نہیں بلکہ مختلف مقامات پر خونریزی میں مصروف تھے۔ عراق خصوصاً بصرہ اور یمامہ، صنعاء، عمان، اصطخر، سابور، فارس، مدائن، ساباط، رے وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، مصعب بن زبیرؓ اور دیگر نامی گرامی سپہ سالاروں عبداللہ بن حارثؓ، عمر بن عبیداللہؓ ابراہیم بن مالک اشتر اور خصوصاً مہلب بن ابی صغرہ، کے ذریعہ ہر جگہ اُن کا استیصال کیا اور ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۷۳ھ میں حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ شہید کر دیے گئے۔

ملوکیت کا تسلط

حضرت حسینؓ ملوکیت کے آگے بند باندھنے اور احیاءِ خلافت راشدہ کی جدوجہد میں جس طرح کام آئے تھے اسی طرح عبداللہ بن زبیرؓ بھی اسی جدوجہد میں کام آ گئے۔ عبدالملک بن مروان نے ۷۱ھ میں عراق پر فوج کشی کی اور دیر جاثلیق میں سخت معرکہ کے بعد مصعب بن زبیرؓ شہید ہو گئے۔ اس طرح عراق پر عبدالملک کا قبضہ ہو گیا۔ عبدالملک نے حجاج بن یوسف ثقفی کو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلہ کے لیے حجاز بھیجا۔ ابن زبیرؓ نے بڑے استقلال، ہمّت اور مردانگی کے ساتھ مدافعت کی لیکن آپ کی طاقت کمزور ہو چکی تھی۔ آپ کے ساتھیوں نے بھی ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔

ان حالات میں حضرت عبداللہ اپنی والدہ سے مشورہ لینے گئے۔ حضرت اسماء نے فرمایا! بیٹا تم کو اپنی حالت کا اندازہ خود ہو گا! اگر تم حق پر ہو اور حق ہی کے لیے لڑتے ہو تو اب بھی لڑو کر تمہارے بہت سے ساتھیوں نے اس کے لیے جان دی ہے اور اگر دنیا طلبی کے لیے لڑتے تھے تو تم سے بُرا کون ہو گا کہ خود اپنے کو

ہلاکت میں ڈالا اور اپنے کتنے ہی ساتھیوں کو ہلاک کیا اور اگر اپنے ساتھیوں کی وجہ سے مجبور ہو تو یاد رکھو شریفوں اور دینداروں کا یہ شیوہ نہیں ہے تم کو کب تک دنیا میں رہنا ہے۔ جاؤ حق پر جان دینا، دنیا کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے[1]

اس جواب پر عبد اللہ ابن زبیرؓ نے اپنی والدہ کی پیشانی چوم لی۔ گئے اور بڑی پامردی سے لڑکر شہید ہو گئے۔ اِنّا للہ وانا الیہ راجعون۔

کارنامے (۱) آپ کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے خلافت راشدہ کو بحال کرنے اور ملوکیت کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔

(۲) آپ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے مختار ثقفی کی بے دین تحریک اور اقتدار سے اسلام اور مسلمانوں کو نجات دلائی۔

(۳) تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے خوارج کا زور توڑا ان کے مظالم سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور ان کے غلط عقائد کی تردید کر کے مسلمانوں کو گمراہی سے بچا لیا۔

(۴) آپ نے امن و امان، عدل و انصاف اور جنگ و جہاد کے لیے جو بھی شخصی اور ملکی قوانین جاری کیے وہ خالص قرآن و سنّت پر مبنی تھے۔ آپ نے کوئی حکم قرآن و سنّت کے خلاف نافذ نہیں کیا۔

(۵) آپ کی اپنی زندگی بھی بالکل سادہ اور کتاب و سنّت کے مطابق تھی۔ بیت المال کو آپ نے خدا اور خلق خدا کی امانت سمجھا۔ تعمیری کام انجام دیے۔ خصوصاً کعبہ مکرمہ از سر نو بالکل اس نقشہ کے مطابق تعمیر کیا جو خود حضورؐ کے

---

[1] مستدرک حاکم، ابن اثیر بحوالہ کتاب مذکور صفحہ ۹۳

پیشِ نظر تھا۔

(۶) حضرت حسین رضؓ کے کارناموں کی تائید آپ نے اپنے عمل سے کی اور اس تصور مذہب کو تقویت پہنچائی اور زندہ رکھنے کی کوشش فرمائی جو نبیؐ نے پیش فرمایا تھا۔

(۷) آپ نے عادل اور دیندار عامل مقرر فرمائے پھر بھی اگر کسی عامل کی شکایت آپ کے کان تک پہنچی فوراً تحقیق حال کے بعد اس کا تدارک کیا۔ چنانچہ ۶۷ھ میں اپنے صاحبزادے حمزہ کو بصرہ کا گورنر مقرر فرمایا لیکن جب ان کی بے اعتدالیوں کی آپ کو خبر ہوئی تو حمزہ کو معزول کر کے مصعب ابن زبیرؓ کو وہاں کا عامل بنا دیا۔ یہ وہ عمل ہے جو خلفائے راشدین کے طرز عمل کے مشابہ تھا۔

(۸) آپ کے عہد میں نظم مملکت بالکل خلافت راشدہ کے مطابق تھا۔ چنانچہ عدلیہ انتظامیہ سے بالکل آزاد تھی۔ آپ کے عہد میں قاضی شریح، قاضی عابس، قاضی ہشام بن ہبیرہ اور قاضی عبداللہ بن عتبہ بن مسعودؓ وغیرہ قاضی رہے۔

سیرت واخلاق

آپ کی سیرت واخلاق سے بہتر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے حکومت وخلافت کو کس لیے ہاتھ میں لیا؟ کیا خدانخواستہ اقتدار اور ہوس حکمرانی نے آپ کو شکار کر لیا تھا؟ معاذ اللہ! یا احیاء خلافت راشدہ اور ملوکیت کے آگے بند باندھنا اور سیاست میں ولی عہدی کی جو بدعت چل پڑی تھی اس کا قلع قمع کرنا آپ کے پیش نظر تھا؟

آپ فضل وکمال میں اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ قرآن دانی اور فہم قرآن میں جو مقام آپ کو حاصل تھا اس کے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ بھی قائل تھے۔ آپ نے احادیث خود حضورؐ سے، اپنے والد حضرت زبیرؓ سے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے، حضرات خلفائے راشدین سے اور بعض دوسرے

بڑے بڑے صحابۂ کرام رضؓ سے حاصل کی تھیں۔

فقہ میں بھی آپ کو اونچا مقام حاصل تھا۔ مدینہ کے صاحبانِ علم افتاء میں جو صحابۂ کرام موجود تھے ان میں آپ بھی شامل تھے۔ عربی میں تو خاصہ مقام حاصل تھا۔ دیگر زبانوں سے بھی واقف تھے۔ آپ کے غلام مختلف قوموں کے تھے ہر ایک سے اس کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ فصاحت و بلاغت میں بھی آپ کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ تقریر و خطابت میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے حتیٰ کہ علامہ جاحظ نے آپ کی تقریر کو اپنی کتاب البیان والتبیین میں جگہ دی ہے۔

آپ کو عبادات کا شغف تھا، ریاضت اور زہد و تقویٰ کا گویا نمونہ تھے۔ آپ کی نماز نبیؐ کی نماز کے بالکل مشابہ تھی۔ انتہائی سکون اور استغراق کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اللہ کو دیکھ رہے ہیں، یا بالکل ساکت جیسی سوکھی لکڑی کھڑی ہو۔ رکوع اتنا طویل ہوتا کہ اتنی دیر میں سورہ بقرہ ختم کر لیتے، سجدہ اتنا طویل ہوتا اور اس قدر سکون و اطمینان سے کرتے کہ چڑیاں ان کی پیٹھ پر بیٹھ جاتیں حتیٰ کہ جب کعبہ مکرمہ کا محاصرہ کیا جا چکا تھا اور چاروں طرف سے سنگ باری ہوتی تھی تو پتھروں کی اس بارش میں بھی انتہائی سکون و اطمینان سے نماز پڑھتے تھے۔ ایک نماز کیا! ہر عبادت سے ان کو ایسا ہی شغف تھا۔

اتباعِ سنت کا اہتمام ہر کام اور موقعہ پر اتباعِ سنت کا آپ بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ ایک بار ان کے اپنے بھائی عمرو بن زبیرؓ کے درمیان کوئی جھگڑا ہو گیا۔ مقدمہ سعید بن عاص کی عدالت میں پیش ہوا۔ حاکم نے ان دونوں حضرات کو اپنے برابر میں جگہ دی۔ عمرو بن زبیرؓ تو بیٹھ گئے

لیکن عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا کہ یہ طریقہ سنّت کے خلاف ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ کو حاکم کے سامنے بیٹھنا چاہیے۔ اتباع سنّت کا یہی اہتمام تھا جس کی وجہ سے آپ نے یزید کی ولی عہدی اور خلافت کو تسلیم نہیں کیا کیونکہ یزید کی ولی عہدی اور خلافت، قیصر و کسریٰ کی سنّت کا احیا تھا اور سنت نبوی کے خلاف تھا۔

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ بڑے بہادر، شجاع باہمّت اور جری تھے۔ حق گوئی اور بے باکی بھی شجاعت اور جرأت ہی کا ایک رُخ ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ کی سیاسی تدبیروں، فوجی دھمکیوں اور داد و دہش کی تھیلیوں نے اچھے اچھوں کے منہ بند کر دیے تھے لیکن عبداللہ ابن زبیرؓ نے ولی عہدی کی بدعت کو تسلیم نہیں کیا۔ پھر یزید کا دور آیا اور آپ پر پیہم فوجی دباؤ ڈالا گیا۔ حتیٰ کہ آپ شہید کر ڈالے گئے مگر آپ نے سنّت کے خلاف بیعت خلافت نہیں کی۔

حضرت زبیرؓ دولتمند آدمی تھے۔ ان کا تجارتی کاروبار بہت وسیع تھا۔ اپنے بعد پانچ کروڑ کا سرمایہ چھوڑا تھا۔ اس میں سے ایک تہائی کی وصیّت اپنے بیٹے عبداللہ ابن زبیر کے لیے کر گئے تھے۔ جائداد اور مکانات اس کے علاوہ تھے۔ غرضکہ ابن زبیرؓ بلند سیرت اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے، فضل و کمال کے مالک تھے، ذوق عبادت اور اتباع سنت کے ولولے سے سرشار تھے، حق گوئی میں بے مثال تھے۔ دولت دین کے ساتھ دولت دنیا بھی رکھتے تھے۔ آپ کی سیرت کہتی ہے کہ محض دنیا کی خاطر آپ نے کاروبارِ خلافت کو ہرگز ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

مجدّد اعظم

۶۱ھ / ۶۷۹ء تا ۱۰۱ھ / ۷۱۹ء

اسلام پر جاہلیت اور ملوکیت نے جو حملہ کیا تھا، سیاست اور مذہب کی تفریق نے دین کی جامعیت کے خلاف جو فتنہ برپا کیا تھا، شورائیت اور اسلامی جمہوریت کے بجائے شخصی اور خاندانی استبداد نے جو یورش کی تھی، انتخاب کے بجائے ولی عہدی کی قیصر و کسریٰ کی سنّت نے جو جنم لیا تھا اس فتنہ کا سر کچلنے کی جدوجہد میں اور اسلام کے تصور مذہب کی جامعیت کو محفوظ رکھنے کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے ہی میں حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جام شہادت نوش کیا تھا، سروں کی قربانی پیش کی تھی اور تختۂ دار پر لٹکائے گئے۔

اصلاح و تجدید کی کوشش میں یہ لوگ قربان ہوتے رہے مگر یہ اژدہا پروان چڑھتا رہا حتیٰ کہ مشیت ایزدی نے عمر بن عبدالعزیز کو منتخب کیا۔ اچانک تخت خلافت پر پہنچتے ہیں اور حضرت یوسفؑ کی سنت کے مطابق حکومت و اقتدار کی طاقت سے کام لے کر تجدید و احیاء دین کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور اس شان سے انجام دیتے ہیں کہ ایک بار پھر خلافت راشدہ کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔

تعارف نام عمر، والد کا نام عبدالعزیز اور دادا کا نام مروان بن حکم تھا۔

آپ کی پیدائش شہر حلوان میں ۶۱ھ میں ہوئی، جہاں آپ کے والد نے اپنے دفاتر منتقل کیے تھے اور اسے اپنا دارلامارۃ قرار دیا تھا[عہ]۔ آپ کے والد عبدالعزیز ۲۱ برس مصر کے گورنر رہے اس لیے آپ کی پرورش ناز و نعمت اور عیش و عشرت کے گہوارے میں ہوئی۔ آپ خلیفہ عبدالملک کے بھتیجے اور داماد تھے۔ مختلف عہدوں پر فائز رہے لیکن زندگی کے ہر دور میں آپ کی فطری سعادت اور صالحیت آپ کے ساتھ رہی۔ آپ کے اسلامی ذہن و فکر اور اعلیٰ اسلامی کردار کے نشو و نما میں آپ کی تعلیم و تربیت کو بڑا دخل ہے۔ مشہور و معروف محدث صالح بن کیسانؒ کی نگرانی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ پھر آپ کے والد نے آپ کو مدینہ بھیج دیا۔ وہاں کے مشہور علماء اور فقہائے علم اور تفقہ حاصل کیا۔ میمون بن مردانؒ کہتے ہیں، تمام علماء بن عبدالعزیز کے شاگرد معلوم ہوتے تھے۔ مجاہدؒ کا قول ہے

ہم عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس گئے کہ وہ ہم سے کچھ علم حاصل کریں گے لیکن ہم کو خود ان سے سیکھنا پڑا، جس زمانہ میں مدینہ کے گورنر تھے اس زمانہ میں علماء اور فقہا آپ کے انیس و جلیس تھے۔ اسی زمانہ میں کئی بار امیر حج بھی مقرر ہوئے[عہ]

آپ خود بھی علم تفقہ کے لحاظ سے امام وقت تھے۔ ولید بن عبدالملک نے جب آپ کو مدینہ کی گورنری پر مامور کیا تو آپ نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کیا کہ دوسرے گورنروں کی طرح وہ ظلم نہیں کریں گے ولید نے ان کی اس شرط کو قبول کیا۔ لیکن آپ چونکہ شاہی خاندان کے فرد تھے لہٰذا خلافت سے پہلے کی زندگی میں حد سے زیادہ عیش و تنعم اور دنیا پرستی کے لوازمات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب

عہ مشاہیر اسلام از حسن ابراہیم حسن مصری ص۳۱۶

عہ تاریخ الامت سوم ص۸۳

مدینہ کی گورنری کا چارج لینے گئے تو ان کا اسباب تیس اونٹوں پر لدا ہوا تھا۔ علامہ رجاء بن حیوٰۃ کا قول ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ خوش لباس خوشبو پسند اور اتراہٹ کی چال چلنے والے تھے۔ داڑھی پر عنبر کا سفوف چھڑکا کرتے تھے۔ مگر آپ کی زندگی میں عجیب انقلاب آیا۔

عجب انقلاب

آپ پر خلافت کا بار اچانک آپڑا تھا سلیمان بن عبدالملک کے اگرچہ دس بیٹے تھے۔ مگر کوئی بالغ نہ تھا اور کوئی قسطنطنیہ کی مہم پر گیا ہوا تھا اور کوئی صالح اور باصلاحیت نہیں تھا اس لیے محدث رجاء بن حیوٰۃ کی کوششوں سے اور خود سلیمان بن عبدالملک کی صلاحیت اور نیک نفسی کی بنا پر قرعۂ فال عمر بن عبدالعزیزؒ کے نام نکلا۔ سلطان وابق میں مقیم تھا وہیں مرض الموت میں گرفتار ہوا۔ علامہ رجاء بن حیوٰۃ ساتھ تھے۔ مشورہ کے بعد سلیمان نے اپنے ہاتھ سے وصیت نامہ لکھا اور مہر لگا کر علامہ کے سپرد کیا اور حکم دیا کہ تمام اہل خاندان کو جمع کر کے نامزد خلیفہ کے لیے بیعت لے لیں۔ چنانچہ سب نے بیعت کی، اور پھر سب خلیفہ کی عیادت کرنے گئے۔ اس کے بعد صفر ۹۹ھ میں سلیمان کا انتقال ہو گیا۔

علامہ رجاء نے موت کو مخفی رکھا اور ایک بار پھر سب کو جمع کر کے بیعت لی۔ پھر وصیت نامہ سنایا اور نام ظاہر کیا۔ مجمع نے نام سنا تو کچھ لوگ خوش ہو گئے اور کچھ لوگوں کی گردنیں لٹک گئیں۔ دو شخصیتوں کی زبان سے بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون نکلا۔ ایک عمر بن عبدالعزیزؒ (زبان سے) یہ اچانک کیسا بار گراں مجھ پر آپڑا، دوسرے ہشام بن عبدالملک کی زبان سے کہ لیلائے خلافت ہاتھوں سے نکل گئی ۔۔۔ بارِ خلافت محسوس کرتے ہی عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی میں عجیب انقلاب آیا کہ دنیا ہی بدل گئی گویا انھوں نے ابوذر غفاریؓ

اور ابو ہریرہؓ کا قالب اختیار کر لیا۔ لباس، وضع قطع، چال ڈھال، کھانا پینا اور رہن سہن سب بدل گیا۔ جب آپ کے سامنے معمول کے مطابق شاہی سواری پیش کی گئی تو آپ نے اسے واپس کر دیا اور فرمایا میرے لیے میری ہی اپنی سواری کافی ہے۔ گھر پہنچے تو بار خلافت کے احساس سے چہرہ پریشان تھا۔ خادمہ نے پوچھا خیر تو ہے فرمایا اس سے بڑھ کر اور کیا فکر ہو گی کہ مشرق و مغرب میں امت کا کوئی فرد ایسا نہیں جس کا مجھ پر حق نہ ہو اور اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو۔

کارنامے سب سے بڑی بدعت جو اسلام کے سیاسی اور اجتماعی دائرے میں جاری ہوئی وہ انتخاب اور شورائیت کے بجائے نامزدگی اور ولی عہدی کا طریقہ تھا حتیٰ کہ خود عمر بن عبدالعزیزؒ بھی منصب خلافت پر اسی ولی عہدی کے ذریعہ سے فائز ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کا آغاز اسی پہلو سے کیا۔

(۱) دست برداری: آپ کا سب سے پہلا کارنامہ یہ ہے کہ خلافت سے دست برداری کا آپ نے اعلان فرمادیا اور جب اہل حل و عقد (جو عوام کے منتخب نمائندوں کی حیثیت رکھتے تھے) نے آپ کو دوبارہ منتخب کیا تب آپ نے کار و بار خلافت انجام دینا شروع کیا۔ اس طرح آپ نے عملاً نامزدگی اور ولی عہدی کے بجائے انتخاب کا اسلامی طریقہ رائج کرنے کی کوشش فرمائی۔
چنانچہ مجمع عام میں آپ نے کہا۔

"لوگو! میری خواہش اور عام مسلمانوں کی رائے کے بغیر مجھ پر خلافت کی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ اس لیے میری بیعت کا جو طوق تمہاری گردن میں ہے میں خود اسے اتارے دیتا ہوں۔ تم جسے چاہے اپنا خلیفہ منتخب کر لو۔"

(۲) خلیفہ کی اصل حیثیت: آپ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے خلیفہ کی اصل حیثیت (نیابت الٰہی، نیابت رسول اور نیابت مسلمین) کو محسوس کیا۔ صرف محسوس نہیں کیا بلکہ اس کا اعلان بھی دو ٹوک الفاظ میں کیا۔ مزید برآں اسی زندہ احساس کے ساتھ تمام کاروبار خلافت انجام دیا جبکہ آپ کے پیش رو خلفاء اور بعد کے خلفاء دولود نے اس حیثیت کو ملوکیت میں گم کر دیا تھا اور شخصی اور خاندانی حکومت کے ٹھاٹھ باٹ کی نذر کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے مسلمانوں کے مجمع عام میں فرمایا۔

"تمہارے نبیؐ کے بعد دوسرا نبی آنے والا نہیں ہے اور خدا نے اس پر جو کتاب اتاری ہے اس کے بعد دوسری کتاب آنے والی نہیں ہے۔ خدا نے جو چیز حلال کر دی وہ قیامت تک کے لیے حلال ہے اور جو چیز حرام کر دی وہ قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ میں (اپنی جانب سے) کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ صرف (احکام الٰہی کو) نافذ کرنے والا ہوں۔ خود اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا کرنے والا نہیں ہوں بلکہ محض پیرو ہوں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔ میں تم میں کا کوئی ممتاز آدمی بھی نہیں ہوں بلکہ معمولی فرد ہوں البتہ تمہارے مقابلہ میں خدا نے مجھے زیادہ گرانبار کیا ہے۔

(۳) مغصوبہ جاگیروں، مال و دولت کی واپسی: آپ کا تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ شاہی خاندان نے جن لوگوں کے حق ہڑپ کر لیے تھے، جن زیردستوں کی جاگیریں ہتھیالی تھیں، جن مظلوموں کے مال و دولت پر قبضہ کر لیا تھا۔ آپ نے خاندان کی شدید ترین مخالفت اور سخت غم و غصے کے باوجود وہ تمام چیزیں واپس کیں بلکہ حکومت کے زور قوت سے کام لے کر واپس کرائیں حتیٰ کہ خود آپ کے اپنے قبضے میں موروثی طور پر اس قسم کی جاگیر تھی وہ اہل حق کو واپس کر دی۔ اس موقعہ پر

بعض خیر خواہوں نے کہا اولاد کے تن پیٹ کے لیے کیا انتظام فرماتے ہیں ؟ کہا ان کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں ——

اس کے بعد خاندان والوں کو جمع کر کے فرمایا: "بنو مروان تم کو شرف اور دولت کا بڑا حصہ ملا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آدھا یا دو تہائی مال اور جائداد تمہارے قبضہ میں ہے۔ لوگوں نے کہا خدا کی قسم جب تک ہماری گردن پر ہمارے سر باقی ہیں تب تک یہ جائدادیں واپس نہیں ہو سکتیں۔ انھوں نے قسمیں کھا کر کہا نہ ہم اپنے باپ دادا کو بے دین اور کافر کہہ سکتے ہیں اور نہ اپنی اولاد کو کنگال اور مفلس بنا سکتے ہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز رح نے فرمایا خدا کی قسم اگر آپ لوگ اس سلسلہ میں میری مدد نہیں کریں گے اور میرے ساتھ تعاون نہیں کریں گے تو آپ لوگوں کو رسوا ہونا پڑے گا"۔ اس کے بعد مجمع عام میں تقریر کی "ان لوگوں (خلفاء بنی امیہ) نے ہم اہل خاندان کو ایسی جاگیریں اور عطیات دیے ہیں، خدا کی قسم جن کے دینے کا نہ ان کو حق تھا اور نہ ہمیں ان کے لینے کا۔ اب میں ان سب کو ان کے حق داروں کو واپس کرتا ہوں اور واپسی کے اس کام کو اپنی ذات اور اپنے خاندان سے شروع کرتا ہوں!" اور پھر اسی روز دوپہر تک ساری جاگیریں اصل حق داروں کو واپس کر دیں اور تمام وثیقے قینچی سے کاٹ کر پھینک دیے۔ حتیٰ کہ آپ کی بیوی فاطمہ بنت عبدالملک کو ان کے والد نے ایک قیمتی پتھر یا بیش قیمت ہار دیا تھا اس کے متعلق بیوی سے کہا اسے بیت المال میں داخل کر دو ورنہ مجھ سے علیحدگی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ موصوفہ نے فوراً اسے بیت المال میں داخل کر دیا پھر ایک عرصہ کے بعد فاطمہ کے بھائی نے اپنے دور خلافت میں وہ پھر فاطمہ کو دیا تو وفادار بیوی نے مرحوم شوہر کا واپس کیا ہوا بیش قیمت مال لینے سے انکار کر دیا —— حضرت عمر بن عبدالعزیز رح نے بنی امیہ سے لوگوں کے حقوق

واپس کرانے کے بعد تمام گورنروں کو تاکیدی احکام بھیجے۔ چنانچہ جس کسی کا حق ہڑپ کیا گیا تھا واپس کیا گیا حتیٰ کہ بعض مقامات کے خزانے خالی ہوگئے تو مرکز سے رقم بھیجی گئی۔ آپ کا یہ وہ کارنامہ ہے کہ جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔

(۴) مالیات کی اصلاح: آپ نے جس رخ میں جو خرابی دیکھی اسے خیر و خوبی سے بدل ڈالا۔ حکومت کے جس قدر ناجائز آمدنی کے ذرائع تھے سب بند کر دیے گئے۔ اسی طرح جو مصارف بیجا تھے انھیں بھی روک دیا۔ چنانچہ شاہی اصطبل کے مہتمم نے جب اخراجات طلب کیے تو حکم دیا کہ تمام سواریاں بیچ ڈالی جائیں اور ان کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی جائے۔ ایک ظلم یہ جاری تھا کہ نومسلموں سے بھی جزیہ لیا جاتا تھا اور ان کو موالی کہا جاتا تھا گویا نومسلم بھی ایک طرح کے غلام تھے۔ آپ نے ایک عام حکم جاری کیا کہ کسی نومسلم سے ہرگز جزیہ وصول نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس قدر لوگ مسلمان ہونے لگے کہ سرکاری خزانے کی آمدنی گھٹ گئی اور مصارف کے لیے افسر خزانہ کو قرض لینا پڑا۔ حیان بن شریح نے لکھا ہے کہ یہ صورت حال ہے کیا کیا جائے؟ آپ نے جواب دیا جزیہ بہرحال بند کرو کیونکہ حضورؐ ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے تحصیل وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ آپ نے آرڈر دیا کہ زمین کا معائنہ کیا جائے۔ بنجر زمین کا بار آباد زمین پر اور آباد زمین کا بار بنجر زمین پر نہ ڈالو نوروز کے تمغے، اعراض نویسی، شادی اور گھروں کا ٹیکس اور نکاح خوانی کا معاوضہ نہ لیا جائے اور جو ذمی مسلمان ہو جائے اس پر خراج نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جس قدر ناجائز ٹیکس تھے سب موقوف کر دیے۔

(۵) وظیفوں کا اجراء: اسلامی ریاست نے اپنا یہ فریضہ قرار دیا کہ

اس کے حدود میں مسلم اور غیر مسلم جس قدر بھی معذور اور محتاج ہوں ان سب کے کھانے کپڑے، دوادارو اور تعلیم و تربیت کی ذمہ دار حکومت ہے۔ چنانچہ آپ نے غریبوں، مسکینوں، معذوروں اور محتاجوں کا سروے کرایا، فہرستیں تیار کرائیں اور ان کا وظیفہ مقرر کیا، ناداروں، قرضداروں کے قرض کی ادائیگی کا انتظام کیا، شیر خوار بچوں کے وظائف مقرر کیے۔

(۶) مظالم کا انسداد: جو حکام ظلم و جور کے خوگر تھے سلیمان بن عبدالملک نے ان کی اصلاح کی طرف خاصی توجہ کی تھی پھر بھی اس کا پورا پورا تدارک نہ ہو سکا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس جانب بھی توجہ فرمائی۔ حجاج بن یوسف کے پورے خاندان کو جو سب سے زیادہ ظالم تھا یمن جلاوطن کر دیا۔ آپ نے بدنام حکام کو معزول کر کے حکومت کو پاک کرنے کے علاوہ دیگر حکام کی اصلاح کے لیے ایک عام حکم جاری کیا۔ غرض کہ ظلم و جور کے تمام ذریعوں کو بند کر دیا۔ بدگمانی اور سوءِ ظن پر گرفتاریوں اور سزاؤں کا سلسلہ جاری تھا، آپ نے دوٹوک الفاظ میں حکم دیا بغیر ثبوت کسی کو سزا نہ دی جائے۔ موصل میں چوریاں اور نقب زنی کی کثرت تھی۔ وہاں کے گورنر نے لکھا جب تک لوگوں کو شبہ میں گرفتار نہیں کیا جائے گا تب تک یہ جرائم بند نہیں ہوں گے۔ آپ نے جواب دیا، صرف شرعی ثبوت پر مواخذہ کرو۔ اگر حق ان کی اصلاح نہیں کر سکتا تو خود ان کی اصلاح نہ کرے۔ خراسان کے والی نے لکھا اہل خراسان کو تلوار اور کوڑے کے سوا کوئی تدبیر درست نہیں کر سکتی۔ آپ نے جواب میں لکھا تھا تمہارا یہ کہنا غلط ہے کہ تلوار اور کوڑا ہی انھیں درست کر سکتا ہے۔ نہیں، بلکہ عدل اور حق ان کو درست کر سکتا ہے۔ اسی کو جہاں تک ہو سکے عام کرو۔

ظلم کا ایک طریقہ یہ تھا کہ حکام کم نرخ پر چیزیں خریدا کرتے تھے۔ آپ نے

ایک مستقل قانون نافذ کیا کہ کوئی سرکاری افسر یا اہل کار بازار نرخ سے کم پر ہرگز خریداری نہ کرے۔

(۷) ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت: اسلام نے عام شہری حقوق میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں عدل وانصاف کے ساتھ مساوات کو ملحوظ رکھا ہے اور ذمیوں کو اتنے حقوق دیے کہ دوسرے کسی نظام نے اتنے حقوق اسلام سے پہلے نہیں دیے۔ اور یہ حقوق دور جدید کے جمہوری لادینی اور قومی اسٹیٹ میں اقلیتوں کو صرف کاغذ پر دیے جاتے ہیں لیکن عملاً وہ حق ہڑپ کیا جاتا ہے جو دستوری زبان میں کاغذ پر دیا گیا ہو مگر اسلامی اسٹیٹ نے دستور اور قانون میں جو حقوق اہل ذمہ کو دیے ہیں عملاً بھی ہمیشہ ان کی نگہداشت کی ہے۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے حکومت کو پھر سے اسلامی رنگ میں رنگا تو ذمیوں کے حقوق بھی اگر کہیں پامال ہو رہے تھے انھیں دلوائے اور ایسے لوگوں کو جو اس جرم کے مرتکب تھے سزائیں دیں۔ انھوں نے آرڈر دیا، ذمیوں کے ساتھ نرمی برتو، ان میں جو بوڑھا اور نادار ہو جائے اس کی کفالت کا انتظام کرو۔ اگر اس کا کوئی صاحب حیثیت رشتہ دار ہو تو اسے اس کی کفالت کا حکم دو ورنہ بیت المال سے کفالت کا انتظام کرو۔

اسلام نے غیر مسلموں اور مسلمانوں کی جان، مال اور آبرو کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ اس کا اصول ہے کہ ان کا خون ہمارے خون کی طرح، ان کا مال ہمارے مال کی طرح اور ان کی آبرو ہماری آبرو کی طرح محفوظ ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس طرف بھی پوری توجہ کی۔ چنانچہ حیرہ کے کسی مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا تو آپ نے حیرہ کے حاکم کو لکھا کہ قاتل کو فوراً مقتول کے ورثاء کے سپرد کر دو وہ چاہیں قتل کریں چاہیں معاف کریں۔ اس حکم پر عمل کیا گیا اور مقتول کے غیر مسلم ورثاء نے مسلمان قاتل کو قتل کر دیا۔ ایک

مسلمان ربیعہ سعوذی نے ایک سرکاری ضرورت سے ایک غیر مسلم جبلی کا گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا اور اس پر سواری کی۔ آپ نے ربیعہ کے چالیس کوڑے لگوائے۔ ایک ذمی نے عباس بن ولید پر آپ کی عدالت میں دعویٰ کیا کہ فلاں جائداد میری ہے جس پر عباس قابض ہیں۔ آپ نے عباس سے جواب طلب کیا تو انھوں نے کہا میرے والد نے مجھے جاگیر میں دی ہے۔ میرے پاس سند موجود ہے۔ آپ نے فرمایا خدا کی کتاب کو ولید کی سند پر اولیت حاصل ہے اور عباس سے وہ جائداد ذمی کو دلوادی۔ ابن اشعث نے جو بغاوت کی تھی اس میں خراسان کے ذمیوں نے اس کا ساتھ دیا تھا اس الزام پر حجاج نے ان پر جزیہ دوگنا کر دیا تھا آپ نے یہ جزیہ گھٹا کر پھر اتنا ہی کر دیا جتنا اصلاً تھا۔ ایک بار ہشام بن عبدالملک نے کسی عیسائی پر دعویٰ کیا تو آپ نے عدالت میں دونوں کو برابر جگہ دی جس پر ہشام نے بہت کچھ ناک بھوں چڑھائی لیکن آپ نے کوئی پروا نہیں کی بلکہ سزا دینے کی دھمکی دی۔

(۸) نماز اور زکوٰۃ کے صرف کا نظم: حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کا آٹھواں کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اقامت صلوٰۃ اور تحصیل زکوٰۃ اور اس کا نظم پھر سے زندہ کیا جب کہ پچھلے خلفاء اس طرف سے مداہنت برتنے لگے تھے۔ حالانکہ حکومتِ اسلامی کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اقامت صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی وصولیابی اور صرف کا نظم قائم کیا جائے" وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں، تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وظیفہ انجام دیں۔" (قرآن) چنانچہ آپ نے تمام گورنروں اور افسروں کے نام حکم جاری کیا کہ نماز کے وقت تمام کاروبار چھوڑ دیا کرو۔ جو شخص نماز کو ضائع کرتا ہے وہ دوسرے فرائض، ڈیوٹیوں اور ذمہ داریوں کو بھی ادا نہیں کر سکے گا۔

آپ نے حکم دیا کہ زکوٰۃ کے معاملہ میں حجاج بن یوسف کی روش سے گریز کریں کیونکہ وہ تحصیل زکوٰۃ اور اس کے صرف دونوں میں غلط کار تھا۔ آپ لوگوں کو صدقات اور زکوٰۃ ادا کرنے کی بھی اپنے خطوط میں تلقین کرتے تھے۔

(۹) عیش پرستی اور رنگ رلیوں کا انسداد: رقص و موسیقی اور شراب و کباب کے مشغلے آدمی کو نکمّا بنا دیتے ہیں اور جس قوم میں ان چیزوں کا چلن عام ہو جاتا ہے وہ تنزّل کے گہرے غاروں میں جا گرتی ہے جس قدر یہ مرض بڑھتا ہے اسی قدر انحطاط بھی اس پر مسلط ہوتا جاتا ہے۔ حضرت عمر عبدالعزیزؒ نے تنزل کے تمام اسباب پر پابندی عائد کی کیونکہ اسلام جس طرح کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے وہ اس طرح کی تمام گندگیوں سے پاک ہوتا ہے۔ انھوں نے فرمان جاری کیا، کوئی ذمّی مسلمانوں کے شہروں میں شراب نہ لانے پائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ شراب کی دکانیں بالکل بند کرادیں۔ ایک اور فرمان جاری کیا کہ سفہا کی عورتیں زمانۂ جاہلیت کی طرح بال کھولے نوحہ کرتی ہوئی نکلتی ہیں ان کو سختی سے روک دو، مسلمانوں کو لہو و لعب اور راگ باجے سے باز رکھو اور جو نہ مانے اسے اعتدال کے ساتھ سزا دو۔ آپ نے حمام میں ننگے نہانے اور عورتوں کو حمام میں جانے سے روک دیا۔ جو مرد فیشن پرستی میں عورتوں کی طرح بال بنایا کرتے تھے پولیس کو حکم دیا کہ ایسے لوگوں کے بال کاٹ دو۔ غرض کہ جن دریچوں سے زوال جھانکتا تھا انھیں بند کر دیا اور ان کے نکمّے پن کے سارے دروازوں میں اینٹیں چنوا دیں۔

(۱۰) اقامت دین اور اشاعت اسلام: آپ کا دسواں اور اصلی کارنامہ یہ ہے کہ حکومت کا نصب العین پھر سے اقامت دین، اسلامی قوانین کا نفاذ اور اشاعت اسلام قرار دیا اور حدود حکومت کی توسیع کے بجائے اسلام

کی توسیع اشاعت میں ہر طرح کے مادی، اخلاقی اور حکومت کے ذرائع سے کام لیا۔ فوج کو حکم تھا کسی سے اس وقت تک جنگ نہ کرے جب تک ان کو اسلام کی دعوت نہ دے لے۔ تمام سول حکام کو حکم تھا کہ ذمیوں میں اسلام کی اشاعت کریں اور جو اسلام قبول کرے اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے۔ چنانچہ والی خراسان جراح بن عبداللہ حکمی کے ہاتھ پر چار ہزار انسانوں نے اسلام قبول کیا۔ والیِ مغرب کی تبلیغ سے تمام شمالی افریقہ میں اسلام پھیل گیا۔ مختلف حکمرانوں، زمین داروں کو دعوتی خطوط بھیجے۔ چنانچہ بہت سے راجوں مہاراجوں اور چھوٹے موٹے حکمرانوں اور رئیسوں نے اسلام قبول کر لیا۔ سندھ کے راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ بھی مشرف بہ اسلام ہوا۔ لوگ اس کثرت سے مسلمان ہوئے کہ آمدنی گھٹ گئی۔ بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ لوگ جزیہ سے بچنے کے لیے مسلمان ہو جاتے ہیں، لہذا جب تک ختنہ نہ کرائیں انھیں مسلمان تسلیم نہ کیا جائے۔ آپ نے ان لوگوں کو جواب دیا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی اور رہبر بنا کر بھیجے گئے تھے ختنہ کرانے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے"۔

غرض کہ آپ نے حکومت و سلطنت کی سطح اور معاشرت و معیشت کے ہر پہلو سے جہاں جس قدر غیر اسلامی احکام و قوانین یا جاہلی رسوم و رواج نے جگہ پائی تھی ان کو اکھاڑ پھینکا۔ اور اگر عمر بن عبدالعزیزؒ کو کچھ اور مدت مل جاتی، کچھ اور حیات مستعار کا موقع مل جاتا تو انتقالِ حکومت، نامزدگی کا اور ولی عہدی کا جو غیر اسلامی طریقہ رائج تھا اسے بھی آپ ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی طریقہ انتخاب بھی ضرور رائج کر دیتے۔ آپ کی جلالت شان اور کارناموں کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سالم بن عبداللہؒ نے آپ کو لکھا کہ عمر بن خطابؓ نے جو کارنامے انجام دیے تو وہ دوسرا زمانہ تھا وہ دوسرے لوگ تھے مگر آپ نے

اس زمانے میں عمر بن خطابؓ کی پیروی کی لہذا آپ ان سے افضل ہو گئے۔ اسی لیے بعض محدثین آپ کو پانچواں خلیفہ راشد مانتے ہیں۔

(۱۱) علمی تحریک: آپ کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی آپ نے ایک ایسی علمی تحریک پیدا کی جس کے نتیجے میں اہل دماغ، قرآن وحدیث اور فقہ وغیرہ علوم اسلامیہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور جس کے نتیجے میں اسلام کو امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے مجتہدین میسر آگئے۔ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بقول آپ نے جہاں حکومت کا مزاج اور نقطۂ نظر بدلا، سیاست و مذہب کی تفریق کو مٹایا اور جہاں انتظام وانصرام اور عدل وانصاف کے ساتھ افتاء، وارشاد اور وعظ ونصیحت کو بھی حکومت کے فرائض میں شامل کیا وہیں آپ نے تدوین علوم اور احیاء سنن کا فریضہ بھی انجام دیا۔

حضرت زید بن علی رح

شہادت ۱۲۲ھ

تجدید و احیار خلافت کا ایک جانباز سپاہی

دین و سیاست کی جدائی کی خلیج کو حضرت حسین رض نے کربلا میں اور حضرت عبداللہ بن زبیر رض نے مکہ مکرمہ میں اپنا سر دے کر پاٹنا چاہا مگر وہ وسیع ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ اس نے "فقط چنگیزی" کی شکل اختیار کر لی۔ دستور اور قانون کی رو سے اگرچہ آپ بنو امیہ کے استبداد کو سو فی صد غیر اسلامی حکومت قرار نہ دے سکیں، فقہ کی رو سے خواہ آپ اسے خلافت راشدہ نہ سہی، خلافتِ فاسدہ تسلیم کرنے پر مجبور ہی کیوں نہ ہوں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اپنے عملی روپ میں وہ "فقط چنگیزی" بن کر رہ گئی تھی، لہٰذا لکلِ فرعونٍ موسیٰ کے اصول پر ایسے بزرگ، مجاہد اور مصلح سامنے آتے رہے جو اگرچہ بظاہر بازی پا نہ سکے لیکن سر دے سکنے کی مثال قائم کرنے میں یقیناً کامیاب ہوئے۔

رخصت پر عمل کرنے والوں کی کمی تو حضرت حسین رض اور حضرت عبداللہ بن زبیر رض کے عہد میں بھی نہیں تھی مگر ان حضرات نے عزیمت پر عمل کا بیڑا اٹھایا اور

نوٹ: اس مضمون کی ترتیب میں میرے پیشِ نظر امام ابو حنیفہ رح کی سیاسی زندگی رہی ہے۔

اس راہ میں شہادت کا جام نوش کیا۔ حضرت زیدؓ نے بھی اس راہ کو اپنایا حالانکہ رخصت پر عمل کرنے والے مخلصین ان کے دور میں بھی بے شمار موجود تھے۔ آپ کے سرفروشانہ اقدام کی اہمیت اور آپ کے کارنامے کی واقعی نوعیت سمجھنے کے لیے بنو امیہ کے استبداد کی جھلک اور آپ کی سیرت کا عکس سامنے آنا ضروری ہے۔

بنو امیہ کا استبداد

حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کے مقابلہ میں طاقت استعمال کر کے خلافت حاصل کی تھی اور اس میں وہ نیک نیت تھے پھر انھوں نے طاقت ہی کے زور سے اپنے بیٹے یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت لی تھی اور اس میں بھی وہ نیک نیت تھے مگر ان کی یا کسی کی نیک نیتی سے استبداد شورائیت سے بدل نہیں سکتا۔ آپ کے بعد یزید نے بھی طاقت کے ذریعہ اپنی حکومت قائم رکھی اور ملت اسلامیہ کی وحدت کو برقرار رکھنے کی نیک نیت سے اسے ایسا کرنے کا حق بھی تھا لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا محض نیت کی نیکی سے غلط کام صحیح نہیں ہو سکتا۔ طاقت کے ذریعہ حکومت حاصل کرنا طاقت کے ذریعہ اسے قائم رکھنا، ایک خاندان میں محدود کر دینا شورائیت اور انتخاب کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر حکومت کرنا، بیت المال اور خزانے کو خدا اور خلق کی امانت کی طرح نہیں اپنے ذاتی خزانے کی طرح تصرف میں لانا، ظالم گورنروں کو عام مسلمانوں پر مسلط کرنا، عدل و انصاف کے بجائے ظلم و ستم کی چکی چلانا، کیا یہ سب استبداد نہیں تھا؟ ایک یزید کیا بنو امیہ کے گل سرسبد عبد الملک اور ہشام بھی اس سلسلہ میں کسی سے کم نہیں ہیں۔

این خانہ ہمہ آفتاب است

آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ ہر ایک نے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کی ہے! استبداد کے حمام میں سب ننگے ہیں۔ رہے عمر بن عبد العزیزؒ تو وہ بنو امیہ

کے نہیں ملّت اسلامیہ کے رکن رکین اور مجددین کے سرخیل بلکہ مجدد اعظم ہیں۔

یزید، ابن زیاد اور حجاج جیسے رسوائے زمانہ خلفاء اور گورنروں کو چھوڑیے عبدالملک جیسے دینداری اور حلم و بردباری میں شہرت یافتہ خلیفہ کے دربار میں جو کچھ ہوتا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ایک بوڑھے اور نابینا صحابی حضرت جابر بن عبداللہؓ مدینہ منورہ سے دمشق اس لیے تشریف لے گئے کہ واقعہ حرہ کے بعد انتقاماً اہل مدینہ پر جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں اس کی فریاد کریں۔ حضرت جابرؓ رحم کی سفارش اور اپیل کرنے خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

امیر المومنین! آج کل مدینہ طیبہ کی جو حالت ہے وہ آپ کو معلوم ہے اس کے باشندے قیدیوں کی طرح محصور ہیں۔ آپ صلہ رحمی کا خیال فرمائیں تو آپ کو ایسا کرنا چاہیے۔

یہ سن کر عبدالملک غصے سے بھر گیا اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ چونکہ نابینا تھے لہٰذا اس کی ناراضی محسوس نہ کر سکے اور اپنی درخواست دہراتے رہے۔ قریب تھا کہ آپ کے بارے میں کوئی سخت اور ناروا حکم صادر ہو کہ آپ کے شاگرد قبیصہ آپ کو باہر لے آئے اور آپ سے عرض کیا یا ابا عبداللہ اِنَّ هٰؤُلاءِ القوم صاروا ملوکًا۔ (ابن سعد) جناب یہ لوگ (بنو امیہ) اب بادشاہ بن گئے ہیں۔ قبیصہ کو عبدالملک کے دربار میں چونکہ اثر و رسوخ حاصل تھا۔ لہٰذا حضرت جابر بن عبداللہؓ نے فرمایا لیکن تمہارا صاحب (عبدالملک) تمہاری بات تو سنتا بھی ہے اور نہیں بھی سنتا ہے، جو بات منشاء اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے بس اسی کو سنتا ہے (ابن سعد)

سب سے زیادہ قابل رحم حالت کوفہ کی تھی جہاں مسلسل بیس برس تک

ابن زیاد اور حجاج بن یوسف جیسے درندے کی ننگی تلوار سروں پر لٹکتی، چمکتی اور چلتی رہی۔ معمولی معمولی باتوں پر گردن اڑا دینا کوئی بات نہ تھی۔ صحابہؓ کی اولاد اور تابعینؒ کو بھی نہیں بخشا جاتا تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ دم بخود تھا۔ منکرات اور مظالم دیکھتے تھے۔ ہاتھ سے مٹانے کی کوشش تو کجا بڑے بڑوں کی زبانیں بھی خاموش رہنے پر مجبور تھیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے استاد حضرت امام ابراہیم نخعیؒ کے کان میں حجاج کے مرنے کی خبر پڑی تو ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک آئے اور وہ فوراً سجدے میں گر گئے۔ بنو امیہ کے دور استبداد میں بقول مولانا گیلانیؒ لوہے کے عصا سے حکومت قائم تھی۔ زبان سے کسی اصلاحی بول کا ادا کرنا اپنی جان اور خون سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ بڑے بڑوں کے پائے استقلال میں لغزش آگئی تھی۔ کھڑے ہونے اور اٹھنے کے بجائے بیٹھنے کو ترجیح دینے کی روش عام تھی، اور اسی میں عافیت بھی تھی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جذبہ سسکیاں لینے پر مجبور تھا۔ اسلامی نظام اور اسلامی جذبہ حریت و آزادی خود مسلمانوں کے اقتدار کے ہاتھوں لخت لخت ہو رہا تھا۔ ان حالات میں زید بن علیؓ اٹھے اور سنت حسینی کو زندہ کیا۔ عبداللہ ابن زبیرؓ کے نقش قدم پر گامزن ہوئے۔ تجدید و احیاء خلافت کی راہ میں سر دے کر ایک اور سنگ میل قائم کیا۔

ملوکیت کا ایک اور روپ ملاحظہ فرمائیے۔ ہشام بن عبدالملک کو لوگوں نے دیکھا کہ جب وہ حج کو گیا ہے تو اس کا اسباب کپڑے وغیرہ چھ سو اونٹوں پر لدا ہوا تھا (عقد الفرید ج ۱ ص ۳۶۶)

اشعب عہد بنی امیہ کا مشہور مسخرہ تھا۔ ولید نے اسے مدینہ سے طلب کیا اور بندر کی کھال جس میں دم بھی تھی پہن کر ناچنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ اشعب ناچا کودا۔ ولید نے اس بندر نما مسخرہ کے ناچ کو اس قدر پسند کیا کہ خوش ہو کر

ایک ہزار درہم اسے انعام میں دیے۔ یہ تھا اسلامی حکومت کے خزانے کا مصرف؟
انصاف کے پہلو سے بھی استبداد مسلط تھا صرف ایک مثال ملاحظہ کیجئے۔ سلیمان بن عبدالملک کا عہد خلافت ہے۔ خالد بن عبداللہ القسری کی گورنری کا زمانہ ہے۔ طلحہ بن ہرم مکہ مکرمہ کے قاضی ہیں کسی جائداد کے متعلق ایک مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ قاضی صاحب معاملہ کی چھان بین، ثبوت اور شہادت وغیرہ کے مراحل سے گذرتے ہیں اور ایک فریق جس کا نام اعجم تھا، اس کے حق میں فیصلہ کر دیتے ہیں۔ دوسرا فریق گورنر کا آدمی تھا۔ چنانچہ وہ قاضی کے فیصلہ کے خلاف گورنری سے حکم حاصل کر لیتا ہے۔ قاضی صاحب نے اس مداخلت بیجا کو جس سے عدلیہ بے جان ہو کر رہ گئی تھی، بہت محسوس کیا۔ خاموشی سے اپنے بیٹے محمد بن طلحہ کو خلیفہ کے پاس بھیجا۔ خلیفہ نے گورنر کو حکم دیا کہ اس معاملہ میں دخل اندازی نہ کرے لیکن محمد بن طلحہ جس وقت حکم لے کر آئے اور گورنر کے سامنے پہنچے اس نے خلیفہ کا خط پڑھنے سے پہلے ہی محمد بن طلحہ کے سو درّے جلّاد سے لگوائے جس سے ان کا جسم اور لباس خون سے رنگین ہو گیا۔ یہ تھا قانون اور انصاف کا حشر۔

سیرت و کردار حضرت زید ابن علیؒ، حضرت زین العابدینؒ بن حسینؓ کے بیٹے اور حضرت حسین بن علیؓ ابن ابی طالب کے پوتے تھے۔
انتہائی حسین وجمیل بزرگ تھے۔ مقدمہ الروض النضیر کے صفحہ ۹ میں لکھا ہے۔ رنگ گورا، آنکھیں بڑی بڑی، ابرو ملے ہوئے، قد دراز، داڑھی گھنی، سینہ کشادہ اور ناک بلند تھی۔ سر اور داڑھی کے بال سیاہ تھے۔ رخساروں کے اطراف میں تھوڑی تھوڑی سفیدی ظاہر ہو چکی تھی۔ اسی کتاب کے صفحہ ۵ پر حضرت زید کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا بیان درج ہے۔ میں نے زید بن علیؒ کو دیکھا تھا۔ میں نے ان کے زمانے میں ان سے زیادہ فقیہہ کسی کو نہیں پایا اور نہ ان جیسا حاضر جواب اور صاف

گفتگو کرنے والا مجھے ملا۔ درحقیقت ان کے جوڑ کا آدمی اس زمانہ میں نہ تھا۔ شعبیؒ کی روایت مولانا گیلانیؒ نے نقل کی ہے کہ زید بن علیؒ سے بہتر بچہ شاید کسی عورت نے جنا ہو۔ ایسا فقیہہ اتنا بہادر اور قانع اور عابد وزاہد مجھے کوئی دوسرا نظر نہ آیا۔ امام جعفر صادقؒ سے مروی ہے کہ حضرت زیدؒ کی شہادت کی خبر پر فرمایا، واللہ میرے چچا ہم لوگوں میں سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والے، سب سے زیادہ اللہ کے دین کی سوجھ بوجھ رکھنے والے اور صلہ رحمی کرنے والے تھے۔ اور پھر فرمایا، خدا کی قسم دنیا اور آخرت (دونوں اعتبار سے) انھوں نے اپنا جیسا نہیں چھوڑا۔

حضرت زیدؒ کو قرآن کے ساتھ کافی شغف تھا۔ صاحب الروض النفیر نے خود انھیں کی زبان سے نقل کیا ہے۔ خَلَوْتُ بِالْقُرْآنِ ثَلَاثَ عَشَرَ سَنَتًا (ص۵) قرآن میں غور و فکر کے لیے میں نے ۱۳ برس خلوت گزینی اختیار کی ہے۔ اس تیرہ سالہ قرآنی استغراق کے نتیجہ میں حضرت زیدؒ نے کیا حاصل کیا اس کا جواب ان کے قول و فعل کے سوا اور کسی طرح معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا عمل تو یہ ہے کہ جان اور سر دے کر جام شہادت نوش کیا اور قول یہ ہے، وہ فرماتے ہیں میں ان لوگوں سے بری ہوں جو اللہ کو مخلوقات جیسی ہستی خیال کرتے ہیں اور ان سے بھی بری ہوں جنھوں نے اپنی تمام بداعمالیوں کا بوجھ خدا پر ڈال دیا ہے، یعنی جو یہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں کرتے سب کچھ خدا کرتا ہے۔ اور میں ان بدکاروں اور شریروں سے بھی بری ہوں جو کہتے ہیں کہ خدا ان کو یونہی چھوڑ دے گا یعنی جو یہ کہتے ہیں کہ محض ایمان کا دعویٰ کافی ہے اور عمل صالح کی ضرورت نہیں ہے۔ ور میں ان دین باختہ لوگوں سے بھی بری ہوں جو حضرت علیؓ کو کافر کہتے ہیں اور ان رافضیوں سے بھی بری ہوں جو ابوبکرؓ و عمرؓ کی تکفیر کرتے ہیں۔ (امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی ص۹۷)

شہادت سے قبل کے اقوال سے بھی آپ کی سیرت کا بہتر اندازہ کیا جا سکتا

ہے۔

۱۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اپنے دین کو حد کمال تک پہنچانے کا اس وقت موقعہ عنایت فرمایا۔

۲۔ میں سخت شرمندہ تھا کہ رسول اللہ صلعم کی امت کو معروف کا حکم میں نے کیوں نہیں دیا اور منکر سے کیوں نہیں روکا (اب الحمدللہ اس جہاد کے ذریعہ اس کا موقعہ نصیب ہوا۔)

۳۔ خدا کی قسم جب میں نے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت کو درست کر لیا (یعنی ان کا فہم حاصل کیا اور تقاضوں کا شعور حاصل کر کے ان کو پورا کرنے کی توفیق پالی) تو مجھے اس کی پروا نہیں کہ آگ جلائی جائے اور اس میں مجھے جھونک دیا جائے۔ محدث ابو عوانہ رح کا بیان، کان زید بن علی یر الحیاۃ غراماً وما کان ضجراً بالحیاۃ (ص۵۵ مقدمہ ارض النضیر) زید بن علی کے لیے زندگی (گویا) ایک بوجھ بن گئی تھی وہ زندگی سے عاجز آ چکے تھے۔

یعنی امن و عافیت سے بیٹھے رہنا اور ظلم و ستم کی چکی کو زور و شور سے چلتے ہوئے ٹک ٹک دیکھتے رہنا، اس تصور مذہب کو مٹنے دینا جو حضور ﷺ نے پیش کیا تھا کہ مذہب و سیاست دونوں دین ہیں، ان میں تفریق یا تو چنگیزی ہے یا رہبانیت ہے اور خلافت راشدہ کو زندہ کرنے کی کوشش نہ کرنا ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔ وہ اکتا گئے تھے آخر وہ اٹھے اور اپنا سر دے کر ایک روشن اور تابناک مثال قائم کی۔

سلمہ بن کہیل ایک بزرگ تابعی تھے۔ حضرت زید کے مشن کے ہمنوا تھے لیکن اہل کوفہ پر انھیں اعتماد نہ تھا چنانچہ انھوں نے حضرت زید کو کوفیوں کی ہمنوائی پر بھروسہ کر کے اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی تو حضرت زید رح نے فرمایا:

اِنِّیْ امْرُءٌ سَامُوْتُ اِنْ لَّمْ اُقْتَلْ ۔ میں ایک آدمی ہوں اگر قتل نہ ہوا تب بھی بہر حال مروں گا۔

یعنی موت تو بہر حال آنا ہے تو کیوں نہ شہادت کی موت اختیار کی جائے کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ موت کے معمہ کا حل شہادت ہے۔

جان بجاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل!
خود تو منصف باش اے دل ایں نکو یا آں نکو

کیا حضرت زید کے اس جذبہ سے ان کی ذہنیت اور سیرت اور مقصد کی بلندی کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ آپ انھیں سرفروشوں کے سلسلہ کی ایک کڑی ہیں جو خلافت راشدہ بنانے کے لیے تڑپتے تھے۔

عملی اقدام اور شہادت

ہر معاملے اور مہم کے دو پہلو ہوتے ہیں! ایک منفی، بھیانک اور تاریک پہلو جو ہزاروں خطرات سے پُر ہوتا ہے، ہولناکیوں اور ناکامیوں کے صحرا میں منہ کھولے کھڑا نظر آتا ہے اور دوسرا پہلو مثبت، روشن اور تابناک ہوتا ہے، کامیابیاں اور کامرانیاں قدم لیتی اور آگے بڑھ کر استقبال کرتی نظر آتی ہیں۔

باہمّت اور اولوالعزم انسان ہمیشہ مثبت اور تابناک پہلو پر نگاہ رکھتے ہیں اور بے خطر میدان میں کود پڑتے ہیں۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ حضرت حسین رضؓ حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ اور حضرت زید بن علی رضؓ نے مثبت روشن اور تابناک پہلو پر نگاہ رکھنے اور بے خطر میدان میں کود پڑنے کے باوجود آنکھیں میچ کر اقدام نہیں کیا بلکہ پہلے تیاری کی، ہمنوا فراہم کیے، عواقب پر بھی غور وفکر کیا، مشورے بھی کیے، موافقین اور مخالفین کی رایوں پر غور وفکر بھی کیا لیکن ناکامی یا موت کے اندیشے سے ہمت نہیں ہاری اور اللہ پر توکل کر کے اپنی سی کوشش کر گذرے حضرت

زید کو تقدیر نے کوفہ پہنچا دیا تو عوام تو عوام، خواص یعنی اہل علم و تقویٰ کا طبقہ بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کے لیے ٹوٹ پڑا۔ منصور ابن معتمر ایک بزرگ تھے جو امام ابوحنیفہ رح سے تعلق رکھتے تھے اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ خلوت میں گفتگو کرتے اور روتے تھے۔ انھیں منصور کے بارے میں روض النضیر کے صہ۵۵ پر ہے۔

کان منصور ابن معتمر یدور علی الناس یاخذ البیعة لزید بن علی۔ منصور بن معتمر گشت کر کے لوگوں سے حضرت زید بن علی رض کے لیے بیعت لیتے تھے۔

ابن معتمر جیسے بزرگوں کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ چالیس ہزار انسانوں نے حضرت زید رض کے ہاتھ پر بیعت کی اور بنو امیہ سے مقابلہ کا عہد کیا۔ ایک معتمر ہی کیا تمام ہی بزرگ اہل علم اور اہل تقویٰ فکری اور نظری اعتبار سے آپ کے ساتھ تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی مجبوری اور مقہوری کی وجہ سے وہ عملاً میدان میں نہ آسکے! اور ہر ایک مرد میدان بھی نہیں ہوتا وہ حضرت میدان علم و تقویٰ کے شہسوار تھے، میدان وغا کا مرد ہونا ان کے لیے لازم نہیں۔

امام اعمش رح کا قول امام شعبہ رح نے نقل کیا ہے۔ واللہ لولا ضرارة لی لخرجت معہ۔ خدا کی قسم اگر میری آنکھوں میں تکلیف نہ ہوتی تو میں ان کے ساتھ نکل کھڑا ہوتا۔ محدث ابو عوانہ رح کی روایت ہے کہ امام ابو سفیان ثوری رح حضرت زید رح کا ذکر کرتے تو کہتے انھوں نے اپنی جان اللہ کی راہ میں نثار کر دی اور اپنے خالق کی مرضی کی پابندی میں حق کو لے کر کھڑے ہوئے اور اپنے ان آبا و اجداد میں شریک ہو گئے جنھیں خدا نے شہادت سے نوازا تھا۔

امام اعمش رح اور امام سفیان ثوری رح کے علاوہ امام اعظم امام ابوحنیفہ رح

بھی آپ کے ہمنوا تھے فضیل ابن زبیر کا بیان ہے ۔ کنت رسول زید بن علی الی ابی حنیفہؒ : میں امام ابو حنیفہؒ کے پاس زیدؒ کا قاصد بن کر گیا تھا ۔ وہ کہتے ہیں ، امام ابو حنیفہؒ نے سب سے پہلے مجھ سے یہ سوال کیا کہ فقہا اور اہل علم میں سے کون کون صاحب حضرت زیدؒ کے پاس آتے جاتے ہیں ؟ فضیل نے چند بزرگوں کے نام گنائے ۔ غالباً امام صاحب اس طرح تحریک کی کامیابی کا اندازہ کرنا چاہتے تھے ۔ پھر امام صاحب نے وہ تاریخی بیان دیا جو تقریباً سب ہی تذکرہ نویس نقل کرتے ہیں ۔ آپ کہتے ہیں ۔

خروجہ یضاھی خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم بدر ۔ حضرت زید کا اس وقت کھڑا ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوہ بدر کے لیے تشریف لے جانے کے مشابہ ہے ۔

دوسرا جزو آپ کے بیان کا یہ ہے کہ اگر میں جانتا کہ لوگ آپ کو وقت پر چھوڑ نہ دیں گے اور واقعی راست بازی اور سچے عزم کے ساتھ رفاقت کا ثبوت دیں گے تو میں ان کی پیروی کرتا اور ان کے مخالفوں سے جہاد کرتا ۔ پھر امام ابو حنیفہؒ نے ایک ایک ہزار روپے کی دس تھیلیاں فضیل کے حوالے کیں اور فرمایا میں اپنے مال سے حضرت کی خدمت کرتا ہوں ۔ حضرت سے کہنا کہ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں اس سے کام لیں یا اس طرح بقول مولانا گیلانیؒ امام صاحب نے جہادِ بدل[1] کی سعادت حاصل کر لی ۔

بہرحال حکومت بھی غافل نہیں تھی ۔ تحریک پر اس کی نگاہ تھی جیسں صبح کو نماز بعد اقدام کی اسکیم تھی اس صبح کو جب لوگ مسجدوں میں نماز میں تھے حکومت

---

[1] نئی ترکیب ۔ جیسے حج بدل ۔

نے مسجدیں بند کرادیں پھر بھی کوفے کے گلی کوچوں میں مقابلہ ہوا مگر ایک بار پھر کوفیوں نے غدر کیا۔ روایتی اور عادتی غدر جوان کی گھٹی میں پڑ چکا تھا یا ان کے خمیر میں گندھ چکا تھا یا ان کی فطرت اور طبیعت میں سرایت کر چکا تھا۔ اس غدر کی وجہ سے حضرت زیدؒ جلد شہید کر دیے گئے ورنہ بقول اعمشؒ۔

لو وفی له من بالعه لاقامهم علی المنهج الواضح۔ مقریزی صفہ ۵

اگر ساتھ دینے والے حضرت زیدؒ کے ساتھ وفادار رہتے تو وہ ان کو سیدھی راہ پر لا کھڑا کر دیتے۔

بنو امیہ کے خوف سے لوگوں نے آپ کی لاش کو بہتے ہوئے پانی میں دفن کر دیا۔ پھر بھی گورنر نے تلاش کرا کے آپ کا سر دمشق بھیج دیا جو دمشق کے دروازے پر لٹکایا گیا اور دھڑ کوفہ میں کناسہ کے مقام پر ننگا لٹکایا گیا جو چودہ ماہ تک لٹکا رہا۔ اس دوران ہشام مر گیا اس کے جانشین ولید نے لاش اتروا کر جلوا دی اور راکھ دریا برد کرادی۔ ولید کے عہد میں حضرت زیدؒ کے صاحبزادہ یحییٰ ابن زید شہید کیے گئے اور بلخ کے قریب جوزجان میں ان کی لاش اسی طرح ٹانگی گئی جس طرح ان کے والد کی لاش کوفہ میں ٹانگی گئی تھی۔ اور جب خراسان میں عباسیوں نے انقلاب برپا کیا تو آپ کی لاش اتاری گئی اور غم منایا گیا۔

المسعودی نے صفہ ۵۴ پر لکھا ہے کہ اس سال خراسان میں جتنے بچے پیدا ہوئے سب کا نام یحییٰ یا زید رکھا گیا۔

آپ کی دعوت اور کارنامہ

کوفے میں ایک گروہ حضرت زید کے پاس حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ آپ کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ تو فرمایا اللہ کی کتاب کی طرف اور اس کی طرف کہ اللہ کے رسول صلعم کی سنت کو (خصوصاً سیاست و اجتماعیت میں) زندہ کیا جائے

اور یہ کہ دین میں (خصوصاً دین کے سیاست وحکومت کے پہلو میں) جو نئی باتیں پیدا ہو گئی ہیں ان کا ازالہ کیا جائے۔

آپ جب بیعت لیتے تو فرماتے ہم تم کو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور تمہیں بلاتے ہیں کہ آؤ ظالموں سے جہاد کرو۔ جو کمزور ہو گئے ہیں ان کو ظلم سے بچاؤ، اپنے حقوق سے جو محروم کر دیے گئے ہیں ان کے حقوق ان تک پہنچاؤ اور مسلمانوں کا یہ مال جو بیت المال میں جمع ہوتا ہے اس کو مساوی طور پر مسلمانوں میں تقسیم کرایا جائے۔ یہ تھی آپ کی دعوت اور یہی آپ کا کارنامہ ہے کہ ایسے پر آشوب دور میں جب کہ سلطان جائر کے مقابلہ میں کلمہ حق کہنا بھی بڑوں بڑوں کے لیے مصلحت کے خلاف تھا، جب کہ سلطنت میں ظلم وستم اور ناانصافی کا دور دورہ تھا، جب کہ اسلام کا تصور مذہب عملاً پارہ پارہ ہو رہا تھا، جب کہ اصلاح وتجدید کا نام لینا خون سے ہولی کھیلنے کے مترادف تھا، جب کہ دینداری اور اتباع سنّت کی دعوت عملاً ناممکن تھی، آپ نے اس کا بیڑا اٹھایا اور لوگوں کے لیے مثال قائم کی کہ یہ کام کرنے کا ہے خواہ جان کی بازی لگا کر اور سر سے کفن باندھ کر اور خون کے دریا سے گذر کر ہی یہ کام کرنا پڑے ؎

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

نفس زکیہؒ اور سیّد ابراہیمؒ

دو جانباز سپاہی

(ف ۱۴۵ھ)

محمد نفس زکیہؒ اور سیّد ابراہیمؒ دونوں سیّد عبداللہ المحض کے صاحبزادے تھے۔ سیّد عبداللہ المحض کے والد کا نام سیّد حسن المثنیٰ تھا جو سیّدنا حسن بن علیؓ کے صاحبزادے تھے۔

امام مالکؒ نے فتویٰ دیا کہ منصور نے جبراً بیعت لی ہے۔ خلافت نفس زکیہ کا حق ہے۔ نفس زکیہ اگرچہ ایک نہایت دلیر، قوی بازو، فن جنگ سے واقف تھے لیکن تقدیر سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رمضان ۱۴۵ھ میں نہایت بہادری سے لڑکر میدانِ جنگ میں شہید ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بھائی ابراہیمؒ نے علم خلافت بلند کیا اور اس سرو سامان سے مقابلہ کو اٹھے کہ منصور کے حواس جاتے رہے۔ کہتے ہیں کہ اس اضطراب میں منصور نے دو مہینے تک کپڑے نہیں بدلے، سرہانے سے تکیہ اٹھا لیتا تھا اور کہتا تھا کہ میں نہیں جانتا یہ تکیہ میرا ہے یا ابراہیم کا۔ انھیں دنوں ایک روز کہا اس وقت تو یہ فکر ہے کہ ابراہیم کا سر میرے آگے آئے گا یا میرا سر ابراہیم کے آگے جائے گا۔

(سیرت النعمان ط ۵۹، ۶۰)

ابراہیمؒ چونکہ شجاعت اور دلیری کے ساتھ بہت بڑے عالم اور مقتدائے عام تھے، ان کے دعوائے خلافت پر ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ ۱۴۵ھ میں ابراہیم نے جب علم خلافت بلند کیا تو دوسرے پیشوایانِ مذہب کے ساتھ امام صاحب (امام ابو حنیفہ رح) نے بھی ان کی تائید کی۔ خود شریک جنگ ہونا چاہتے تھے لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہ ہو سکے جس کا ان کو ہمیشہ افسوس رہا۔ (ص ۶۰-۶۱ کتاب مذکور)

امام ابو حنیفہ رح نے تائید کی اور حسن بن قحطبہ کو ابراہیم کے مقابلہ سے باز رکھا۔ امام مالک رح نے نفس زکیہ کی رفاقت اور امامت کا فتویٰ دیا اگرچہ لوگ منصور کی بیعت کر چکے ہوں۔ مولانا سید سلیمان ندوی رح لکھتے ہیں "آپ نے (امام مالک رح) نے علی الاعلان فتویٰ دیا کہ خلافت نفس زکیہ کا حق ہے عباسیوں نے زبردستی بیعت لی ہے۔ (حیات امام مالک رح ص ۷۵)

اس قسم کی روایتوں نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ " محمد نفس زکیہ رح اور سید ابراہیم رح اسی سلسلہ کی کڑی ہیں جو کربلا سے بالاکوٹ تک دراز ہے۔ بلکہ اس کا سلسلہ انشاء اللہ قیامت تک قائم رہے گا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

الجہاد ماضٍ الی یوم القیامۃ او کما قال۔

یعنی جہاد کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

بنو عباس کے مظالم | بنو عباس نے جس دعوے کے ساتھ عنان خلافت ہاتھ میں لی تھی، یہ تھا کہ ہم اہل خیر و صلاح ہیں، ہم سے ظلم و فساد کا اندیشہ نہیں ہے۔ اے اہل کوفہ تم ہمیشہ سے ہمارے محب رہے، اس راہ میں تم نے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں اور سخت سے سخت

ظلم سہے۔ (پہلا خطبۂ خلافت سفاح بتاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۲ھ) ہم نے اس خلافت کی کوشش زرو جواہر جمع کرنے کے لیے نہیں کی ہے نہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ عالیشان محلات بنوائیں اور باغات لگوائیں اور ان میں نہریں جاری کریں بلکہ ہم نے دیکھا کہ:

ہمارے حقوق ہضم کیے جا رہے تھے، ہمارے بنی اعمام کی تحقیر کی جا رہی تھی، رعایا پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے اور ان کے مال پر دست درازیاں روا رکھی جاتی تھیں، ان امور کو ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اب اللہ، رسولؐ اور ان کے محترم چچا عباسؓ کا ذمہ ہے کہ ہم تمہارے ساتھ کتاب وسنّت کے مطابق برتاؤ کریں گے اور وہی طریقہ اختیار کریں گے جو رسولؐ اللہ کا تھا۔ (تقریر داؤد بن علی بتاریخ مذکورہ)

مگر ان کا عمل یہ تھا کہ اپنے خاندانی لوگوں اور اپنے بھائیوں کو اس طرح پامال کیا اور فنا کے گھاٹ اتارا اور ان کے مٹانے میں جس قلبی قساوت کا ثبوت دیا اس کی مثال مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں جس قدر بنو امیہ تھے ان کو سفاح کے چچا داؤد بن علی نے تہ تیغ کر ڈالا۔ اس کے بھائی سلیمان بن علی نے بصرہ کے بنو امیہ کو قتل کیا اور لاشوں کو راستوں پر ڈال دیا۔ عبداللہ بن علی نے شام میں بنو امیہ کو تلاش کر کر کے مار ڈالا۔

حتیٰ کہ حضرت امیر معاویہؓ، یزید اور عبدالملک وغیرہ خلفائے بنی امیہ کی قبروں کو بھی کھود کر پھینک دیا، اور جو لاش صحیح سالم نکلی اس کو جلا کر راکھ ہوا میں اڑا دی۔

کوفہ میں خود سفاح نے یہی کیا۔ ایک دن تخت پر بیٹھا ہوا تھا کرسیوں پر

بنو ہاشم جلوہ افروز تھے، بنو امیہ بھی ایک جانب بیٹھے تھے کہ ایک شاعر نے کچھ اشعار سنائے۔ سفاح غصّہ میں بھر گیا اور بنو امیہ کو مخاطب کر کے کہا۔ کم بختو! تم ابھی تک اس دنیا میں دادِ عیش دے رہے ہو۔ پھر خراسانیوں کو حکم دیا وہ ان کے اوپر ٹوٹ پڑے اور سب کو قتل کر ڈالا۔

ان کا ظلم صرف بنو امیہ تک محدود نہ تھا۔ ابو سلمہ خلاّل جو وزیر آل محمدؐ کے نام سے مشہور تھے اور جنھوں نے خلافت بنی عباس کے قیام میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے ان کو محض اس شبہ پر کہ وہ خلافت کو آل علی میں منتقل کرانا چاہتے تھے قتل کرا دیا۔ یہی الزام لگا کر کہ تم خلیفہ کے سچے خیر خواہ نہیں ہو۔ شیخ النقبا سلیمان بن کثیر خزاعی کو ابو مسلم خراسانی نے قتل کر دیا حالانکہ انھوں نے خلافت کے قیام میں ابو سلمہ خلال کی طرح کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ منصور نے خود ابو مسلم خراسانی کو بھی تہ تیغ کر ڈالا۔ منصور نے بنی حسن پر بھی مظالم کے پہاڑ توڑے۔ حضرت حسن ابن علیؓ کے ایک بیٹے کا نام بھی حسن تھا۔ ان کے بیٹے عبداللہ المحض اپنے دور میں آل ابی طالب کے شیخ تھے۔ منصور نے ان کی اولاد، بھائیوں اور بھتیجوں کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا اور یہ سب اس قید خانہ ہی میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ سب حضرات بنی حسن کے شیوخ میں سے تھے ـــ ابن طقطقی کا بیان ہے، بنی حسن کا ایک شخص آ کر منصور کے سامنے کھڑا ہو گیا، اس نے دریافت کیا کیسے آئے؟

وہ بولا میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھے میرے خاندان والوں کے ساتھ قید میں ڈال دیں کیونکہ ان کے بعد میں زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ ان کے بغیر زندگی میں کوئی لطف ہی نہیں۔ چنانچہ منصور نے اسے گرفتار کر لیا! اس نوجوان کا نام علی تھا اور یہ حسن بن علی کا پرپوتہ تھا ـــ انھیں قیدیوں میں حضرت حسن بن علیؓ کے ایک اور

پر پوتے تھے محمد بن ابراہیم۔ یہ انتہائی خوبصورت تھے۔ انھیں ان کے حسن وجمال کی وجہ سے دیباج اصفر (زرد ریشم) کہا جاتا تھا منصور نے ان سے پوچھا تم ہی دیباجِ اصفر ہو؟

بولے، جی ہاں! لوگ ایسا ہی کہتے ہیں۔ منصور نے کہا میں تمہیں ایسی موت کا مزہ چکھاؤں گا جو کسی نے نہ چکھا ہو۔ پھر اس نے ان کو اینٹوں میں زندہ چنوا دیا۔

اجتماعی کوشش

بنو ہاشم اگرچہ خلافت کو اپنا حق شمار کرتے تھے اور وہ ابتدا ہی سے اس کے لیے کوشاں تھے لیکن بنو امیہ کے مظالم نے ان کو تڑپا دیا بلکہ ان کا خون کھولنے لگا۔ وہ اکٹھے ہوئے بنو طالب اور بنو عباس سب اکٹھا ہوئے اور حالات کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ہماری کوششیں بار آور ہونے لگی ہیں۔ بنو امیہ میں انتشار پیدا ہو چلا ہے ان کی طاقت کمزور ہوتی جا رہی ہے لہٰذا ہمیں اپنا کام اور کوشش جاری رکھنا چاہیے۔ بلکہ اپنی طاقت کو مجتمع کرکے کوششوں میں اور زیادہ تیزی پیدا کر دینا چاہیے۔ انھوں نے طے کیا کہ ہمارا ایک امام ہونا چاہیے جس کے ہاتھ پر ہم سب بیعت کرلیں، تاکہ ہماری کوششیں رائیگاں نہ جائیں۔ چنانچہ سب نے نفس زکیہ محمد بن عبداللہ بن حسن کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ نفس زکیہ ہاشمی سادات میں اپنے علم وفضل اور تقویٰ وطہارت کے اعتبار سے ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اس اجتماع میں سفاح اور منصور وغیرہ عباسی اعیان موجود تھے اور سب نے نفس زکیہ کی بیعت کرلی تھی۔ اس کے بعد تحریک آل بیعت زور شور کے ساتھ مگر خفیہ اور انڈر گراؤنڈ چلتی رہی۔ آخر کار کامیابی کے مراحل سے ہمکنار ہونے کا موقعہ آیا تو آل عباس نے اسے بڑی ہوشیاری کے ساتھ صرف بنی عباس کے لیے مخصوص کرلیا۔ ابو مسلم خراسانی نے انقلاب

برپا کر کے بنو عباس کی سلطنت قائم کر دی۔ سفاح نے بنو امیہ کی لاشوں پر اپنا قصرِ حکومت قائم کیا۔ اس کے بعد عنانِ خلافت منصور کے ہاتھ میں آئی۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ علویوں کو اُبھرنے کا موقعہ نہ دیا جائے، جہاں تک ہو سکے ان کو پامال کیا جائے۔ وہ نفس زکیہ کو گرفتار کرنے اور قتل کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ اس کو یہ دھن اس لیے سوار تھی کہ لوگ فضل و شرف اور قیادت کے اوصاف کے لحاظ سے نفس زکیہ ہی سے عقیدت کے جذبات وابستہ رکھتے تھے۔

وہ دور جس میں نفس زکیہ نے حکومت میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی تھی، شخصیتوں کا دور تھا۔ کوئی بھی تحریک کسی بھی اعلیٰ یا ادنیٰ مقصد کے لیے شخصیتوں ہی کے بل بوتے پر چلا کرتی تھی۔ لوگ دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنے اپنے لیڈروں (اماموں) کے ساتھ غلو آمیز حد تک اعلیٰ صفات ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ شخصیتوں کے ساتھ عقیدت، غلو آمیز عقیدت کے بعد ہی لوگ اپنا تن من دھن تحریکوں یا شخصیتوں کے لیے قربان کرنے اور تج دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ چنانچہ نفس زکیہ کے لیے بھی ایسے ہی اوصاف ثابت کرنے اور ایسی ہی عقیدت کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی گئی۔ ان کو امام مہدی بھی ثابت کیا گیا۔

انقلاب اور شہادت

جب حکومت بنی عباس کے ہاتھوں میں آگئی تو انھیں اپنی جان کا اندیشہ لاحق ہوا۔ چنانچہ یہ چھپے چھپے پھرتے تھے لیکن جب ان کو اپنے والد اور اپنے خاندان کے ساتھ مذکورہ سلوک کا علم ہوا تو یہ مدینہ میں ظاہر ہوئے اور کھل کر انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ مدینہ کے تمام سربرآوردہ لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔ انھوں نے مدینہ پر تسلط قائم کر لیا۔ منصور کے عامل کو معزول کر دیا اور اپنا عامل اور قاضی مقرر کیا۔ منصور اور نفس زکیہ کی کافی دنوں تک خط و کتابت رہی جس میں فصاحت و بلاغت کے

نادر نمونے ملتے ہیں، دونوں کے نقطۂ نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ آخر ۱۴۵ھ میں منصور نے موسیٰ بن عیسیٰ کو ایک لشکر جرار کے ساتھ بھیجا۔ جنگ ہوئی اور مقام احجار الزیت میں نفس زکیہ کو شہید کر دیا گیا۔ اسی لیے ان کو قتیلِ احجار الزیت کہا جاتا ہے۔ ان کا سر منصور کے پاس بھیجا گیا۔

قتیلِ باخمریٰ نفس زکیہ کے بھائی سید ابراہیم بن عبداللہ المحض جس زمانے میں روپوش تھے اس دور میں منصور کو ان کی بڑی تلاش تھی لیکن وہ چھپتے چھپاتے بصرہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسکیم یہ تھی کہ مدینہ میں نفس زکیہ اور بصرہ میں سید ابراہیم بیک وقت انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں لیکن سید ابراہیم کے بیمار پڑ جانے سے یہ اسکیم فیل ہو گئی۔ سید ابراہیم نفس زکیہ کی شہادت سے پہلے انقلاب کا جھنڈا بلند نہ کر سکے، اگرچہ ابراہیم نے بڑی جمعیت اکٹھا کر لی تھی اور بڑے زور شور سے اٹھے تھے اور ایک بار منصور کے استبداد کو لرزہ براندام کر ڈالا تھا مگر تقدیر کے آگے تدبیر ہمیشہ شکست کھا جاتی ہے۔ چنانچہ منصور نے ان کے مقابلہ کے لیے بھی عیسیٰ بن موسیٰ ہی کو روانہ کیا۔ کوفہ کے قریب باخمریٰ نامی مقام پر جنگ ہوئی اور سید ابراہیم شہید کر ڈالے گئے۔ یہ واقعہ بھی ۱۴۵ھ میں پیش آیا۔ چونکہ مقام باخمریٰ میں سید ابراہیم قتل ہوئے اس لیے یہ قتیلِ باخمریٰ کہلاتے ہیں۔

کارنامے خلافت راشدہ کے بعد اسلامی حکومت نے جو استبداد کی شکل اختیار کر لی تھی، اس کی اصلاح و تجدید کی خاطر حضرت حسین بن علیؓ، حضرت عبداللہ بن زبیر اور زید بن علیؓ نے جو کارنامے انجام دیے تھے وہ کچھ اس طرح ہیں۔

۱۔ علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کے باوصف سیاست میں حصہ لیا بلکہ

اپنا سر دے کر اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔

۲۔ اپنے عمل سے ثبوت دیا کہ دین کے کسی پہلو میں بھی خواہ وہ سیاست ہی کا پہلو ہو بدعت سر اٹھائے تو اسے کسی حال میں بھی برداشت نہیں کرنا چاہیے۔

۳۔ اسلامی حکومت کو ملوکیت کی راہ چلنے سے باز رکھنے کے لیے جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے۔

۴۔ کتاب وسنت کے مطابق سادہ زندگی گزار کر اور سیاست میں بھی تقویٰ کا دامن نہ چھوڑ کر اس تصور دین کو زندہ کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا تھا۔

نفس زکیہ اور سید ابراہیم نے ان کارناموں کو زندہ کیا، ان کی یاد تازہ کر دی اور زبان وقلم کی نوک کے علاوہ زبان شمشیر سے سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہا اور جہاد اکبر کی فضیلت حاصل کی، اور شہادت کا رنگین جام نوش کیا۔ طاب اللہ ثراھما۔ مختار ثقفی اور عبدالرحمٰن بن اشعث جیسے لوگوں نے بھی بنو امیہ اور بنو عباس کے خلاف تلوار اٹھا، لیکن ان جیسے لوگوں کو کوئی بھی ہوشمند تحریکِ اصلاح وتجدید کا علمبردار قرار نہیں دے سکتا لیکن حسینؓ عبداللہ ابن زبیرؓ، زید بن علیؓ، نفس زکیہؒ اور سید ابراہیمؒ کے اوصاف، متقیانہ زندگی، امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ جیسے بزرگوں کا ان کی تائید کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ حضرات مخلص تھے۔ والعلم عند اللہ!

حضرت امام ابو حنیفہؒ مجتہد اعظم

۸۰ھ تا ۱۵۰ھ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں لاکھوں مربع میل تک اسلامی حکومت نے وسعت اختیار کر لی تھی۔ کل جزیرۃ العرب پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔ صدیق اکبرؓ کے مختصر عہد میں عراق اور شام کے وسیع رقبہ پر اسلامی اقتدار قائم ہو گیا۔ عہد فاروقی میں ایران اور مصر بھی اسلامی علم کے تحت آ گئے۔ دور عثمانی میں مشرق میں ایران کے دور دراز علاقے اور مغرب میں افریقہ کا وسیع رقبہ فتح ہو گیا۔ بنو امیہ کے دور میں فتوحات کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ مشرق میں چینی ترکستان اور کاشغر تک اور مغرب میں اسپین اور فرانس کے بعض علاقوں تک اسلامی اقتدار وسیع ہو گیا۔

دنیا کے اس عظیم ترین اقتدار کے تحت، ایک عظیم ترین تمدن برپا تھا۔ اس کی ہمہ گیر ضرورتیں اور نت نئے مسائل تھے۔ دیوانی اور فوجداری کے بے شمار مقدمات تھے۔ معاشرت، معیشت اور سیاست، غرض زندگی کے ہر پہلو میں قوانین کی، مرتب اور مدون قوانین کی، سخت ضرورت تھی۔ اس وسیع سلطنت کے لیے تعزیرات کا دفتر درکار تھا۔

اس ضرورت کے تحت ایک عظیم اسلامی مقنن اور فقیہ درکار تھا بلکہ مجتہد اعظم کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ انسانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مردانِ

کار پیدا فرماتا ہے۔ اس نے دنیا کی ملّت اسلامیہ اور اس وسیع سلطنت کی اس عظیم تر ضرورت کے لیے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو پیدا کیا۔

تعارف

امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کا نام نعمان، آپ کے والد کا نام ثابت اور دادا کا نام بھی نعمان ہے۔ آپ کے دادا صاحب مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کا نام زُوطیٰ تھا۔ وہ ایران کے رہنے والے تھے۔ شہر کے مرزبان اور رئیس تھے۔ انھوں نے حضرت علی کے دور میں اسلام قبول کیا۔ اور مرکز خلافت کوفہ منتقل ہوکر سکونت اختیار کر لی آپ کے والد ثابت کوفہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کو حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے بزرگانہ شفقت کا اظہار فرمایا اور ان کی اولاد کے واسطے دعائے خیر فرمائی۔

امام صاحب ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ عبدالملک بن مروان کا عہدِ خلافت تھا۔ اس زمانے میں چند صحابۂ کرامؓ بھی حیات تھے۔ بعض صحابہؓ تو امام صاحبؒ کے عہد شباب تک موجود تھے حضرت انسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خادم ۹۳ھ تک زندہ رہے۔ بعض صحابۂ کرام ۱۰۰ھ تک حیات تھے۔ لیکن امام صاحبؒ نے کسی سے حدیث بیان نہیں فرمائی۔ ہاں حضرت انسؓ کو آپؒ نے دیکھا ضرور تھا۔ اس لیے آپ کو تابعی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

تحصیلِ علم

امام صاحب تجارت کرتے تھے اور اس میں کامیاب بھی تھے۔ علم اور تعلیم کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں تھی۔ مگر ذہانت اور فطانت فطری طور پر آپ میں موجود تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ عقل و ذہن اور دماغی قوت آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے۔

آپ بازار جا رہے تھے، امام شعبیؒ کے مکان کے سامنے سے گذرے۔

انھوں نے نوجوان کی پیشانی اور چہرے سے ذہانت پہچان لی۔ پاس بلایا اور دریافت کیا۔ صاحبزادے! علم کس سے حاصل کرتے ہو۔ امام صاحب بولے کسی سے بھی نہیں۔ امام شعبیؒ نے کہا ارے، تمہارے اندر تو مجھے بڑی ذہانت اور قابلیت کا جوہر نظر آرہا ہے۔ تم کو علم کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔"

امام صاحبؒ کے دل میں امام شعبیؒ کی اس فہمائش اور نصیحت نے گھر لیا اور تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوگئے۔ بڑے ذوق و شوق، انہماک اور محنت سے علم حاصل کیا۔ ادب، انساب، تاریخ، فقہ، حدیث اور کلام تمام علوم و فنون میں مہارت پیدا کی۔ ساتھ ہی تجارت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ علمی مباحثہ اور مناظرہ سے آپ کو شغف تھا۔ بحث و مباحثہ میں ہمیشہ غالب رہتے تھے مگر اللہ تعالیٰ کو آپ سے ایک عظیم خدمت لینا تھی۔

فقہ میں انہماک

ایک معمولی سے واقعہ نے آپ کو عقائد و کلام کی بحثوں، مناظروں اور جھگڑوں کے بجائے اس طرف متوجہ کردیا۔ واقعہ یوں پیش آیا کہ ایک عورت آئی اس نے ایک مسئلہ پوچھا لیکن آپ نہ بتا سکے اور اسے امام حمادؒ کے پاس بھیج دیا۔ آپ نے سوچا میں ایک عورت کی ضرورت بھی رفع نہ کرسکا، ایسے علم سے کیا فائدہ؟ لہٰذا آپ امام حمادؒ کے حلقۂ درس میں شریک ہوگئے۔

امام حمادؒ کوفہ کے مشہور امام اور استاد تھے۔ حضرت انسؓ سے حدیث کا علم حاصل کیا تھا اور بڑے بڑے تابعین سے فیض حاصل کیا تھا۔ کوفہ میں ان کی درس گاہ مشہور تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی فقہ کا دارومدار انھیں پر تھا۔ ان کا حلقۂ درس بڑا وسیع تھا۔ امام صاحب اگرچہ خود ایک علمی مقام رکھتے تھے لیکن امام حمادؒ کے حلقۂ درس میں پہلے روز بالکل آخر میں سب کے پیچھے آپ کو جگہ ملی۔ چند روز کے بعد ہی امام حمادؒ کو تجربہ ہوگیا کہ ذہانت اور حافظہ میں کوئی بھی ابوحنیفہؒ کا ہمسر

نہیں ہے، تو حکم دے دیا کہ ابوحنیفہؒ سب سے آگے بیٹھا کریں۔

امام ابوحنیفہؒ اگرچہ درس حدیث کے حلقوں میں بھی شریک ہوتے تھے لیکن دس سال تک متواتر امام حمادؒ کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ امام حمادؒ کو بصرہ منتقل ہونا پڑا تو استاد کی زندگی ہی میں استاد کی جانشینی کا مرتبہ حاصل کیا۔

علوم میں مہارت

حضرت عمرؓ نے ۱۷ھ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتح ایران کے ذریعہ کوفہ آباد کرایا تھا۔ کوفہ نے علم و ادب، تہذیب و تمدن، قرآن و سنت اور فقہ ہر پہلو سے مرکزیت حاصل کر لی تھی۔ حضرت عمرؓ کوفہ کو رمح اللہ، کنز الایمان، جمجمۃ العرب یعنی اللہ کا تیر، ایمان کا خزانہ، عرب کی چوٹی یا عرب کا دماغ کہتے تھے۔ حضرت علیؓ نے اس کو اپنا دارالخلافہ بنا لیا تھا۔ ایک ہزار سے زائد صحابہؓ جن میں بدری صحابۂ کرامؓ بھی شامل تھے، کوفہ آئے اور بہت سے یہیں کے ہو رہے۔ انھیں بزرگوں کی بدولت کوفہ میں ہر جگہ حدیث و روایت کے چرچے تھے اس لیے امام صاحب نے ان سے خوب خوب استفادہ کیا۔ کوفہ کے علاوہ بصرہ بلکہ جس جس شہر کو دارالعلم کا درجہ حاصل تھا ان سب سے فیض حاصل کیا۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ بھی تشریف لے گئے۔ وقت کے شیوخ اور نامی گرامی اساتذہ اور محدثین سے علم حاصل کیا۔ حتیٰ کہ آپ خود ماہر فن ہو گئے۔

اجتہاد اور تدوین فقہ

آپ نے قرآن و حدیث سے اصول فقہ و اجتہاد اخذ کیے اور عملاً اجتہاد کیا۔ حتیٰ کہ زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی پہلوؤں کے واسطے اسلامی قانون کا بیش بہا ذخیرہ مرتب اور مدون کر دیا۔ بلکہ زندگی اسی فریضہ کی ادائیگی میں کھپا دی۔ آپ کا یہی وہ کارنامہ ہے

جس نے آپکو امام اعظم بنا دیا اور مجتہد اعظم کا درجہ آپ کو حاصل ہوا۔

اسلامی حکومت جو شخصی اور خاندانی بن چکی تھی، اسے اگر اسلامی قانون مدوّن شکل میں فراہم نہ ہو گیا ہوتا تو وہ یقیناً کسی غیر اسلامی قانون کو اپنا لیتی اور دستور و قانون کے پہلو سے بھی غیر اسلامی ہو جاتی۔ یہ امام صاحب کا وہ کارنامہ ہے جس سے صدیوں اور قرنوں تک کے لیے اسلامی حکومت کم از کم قانون اور تعزیرات کے پہلو سے اسلامی باقی رہی۔ آخر کار مصطفےٰ کمال نے اسلامی قانون کے بجائے غیر اسلامی قانون نافذ کیا۔ یہ کافرانہ جرم اور باغیانہ حرکت شاید اس سے صادر نہ ہوتی، اگر امام ابو حنیفہؒ جیسا کوئی ماہر قانون اسلامی موجود ہوتا، اجتہاد کا دروازہ بند اور فقہ کے سوتے خشک نہ ہو گئے ہوتے۔ غرض کہ یہی وہ کارنامہ ہے جس نے امام صاحبؒ کو حیاتِ جاوید بخشی۔

۱۲۰ھ میں جب امام صاحبؒ کے استاد امام حمادؒ کا انتقال ہوا تو ان کے جانشین آپ ہی قرار پائے۔ اطراف و جوانب سے کثرت سے استفتا، آپ کے پاس آنے لگے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کا تمدن انتہائی وسعت اختیار کر چکا تھا اور روز افزوں ترقی پر تھا۔ عبادات، معاملات، معاشرت، معیشت اور سیاست ہر پہلو میں اس کثرت سے نت نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے کہ مرتب مجموعۂ قانون کے بغیر کام چلنا مشکل تھا بسلطنت کی وسعت اور دوسری قوموں کے میل جول سے درس و تدریس اور تعلیم و تربیت کو بھی وسعت حاصل ہو رہی تھی۔ ایسے حالات میں جن میں قدرتی طور پر امام صاحب اور دیگر اہل علم و دانش کے دماغ اس طرف متوجہ ہوئے کہ جزئیات کو اصول کے ساتھ ترتیب دے کر ایک فن بنا دیا جائے۔

امام صاحبؒ کی طبیعت جس قدر اجتہاد پسند تھی اسی قدر تقویٰ پسند بھی تھی۔ تجارت اور ملکی معاملات سے واقفیت کی بنا پر بھی احساس میں شدت پیدا ہوئی ہوگی۔

قاضی اور منصف، عدالتی فیصلوں میں کسی منضبط دستور و قانون نہ ہونے کی وجہ سے اپنے اپنے اجتہاد اور صواب دید سے کام لیتے تھے، مگر غلطیاں بھی کرتے تھے۔ یہ اسباب تھے جنھوں نے امام صاحب کو مجبور کیا کہ فقہ اور اصول فقہ کی تدوین کا فریضہ انجام دیں۔ چنانچہ آپ نے یہ فریضہ انجام دیا۔

فقہِ حنفی کی خصوصیات

۱۔ فقہ حنفی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کسی ایک شخص کی دماغی کاوش کا ثمر اور نتیجۂ فکر نہیں ہے بلکہ جمہوری فقہ ہے اور اجتماعی قانون ہے جسے تقریباً چالیس اہل علم و دانش اور ماہرینِ فن نے برسوں کی بحث و تمحیص کے ذریعہ مرتب اور مدوّن کیا ہے۔ مثلاً یحییٰ ابن ابی زائدہؒ، حفص بن غیاثؒ، قاضی ابو یوسفؒ، داؤد طائیؒ، حبانؒ، مندلؒ حدیث و آثار میں نہایت کمال رکھتے تھے۔ امام زفر قوتِ استنباط میں مشہور تھے۔ قاسم بن معنؒ اور امام محمدؒ کو ادب اور عربیت میں کمال حاصل تھا۔ امام صاحب نے ان حضرات کی شرکت سے ایک مجلس مرتب کی اور باقاعدہ طور سے فقہ کی تدوین شروع ہوئی۔ امام طحاویؒ نے بسندِ متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ابو حنیفہؒ کے تلامذہ جنھوں نے فقہ کی تدوین کی ہے چالیس تھے۔

تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص باب کا کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا۔ اگر اس کے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تو اسی وقت قلم بند کر لیا جاتا ورنہ نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں۔ کبھی کبھی بہت دیر تک بحث قائم رہتی۔ امام صاحبؒ بہت غور و تحمّل کے ساتھ سب کی تقریریں سنتے اور بالآخر ایسا جچا تلا فیصلہ کرتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ امام صاحبؒ کے فیصلہ کے بعد بھی لوگ اپنی اپنی رایوں پر قائم رہتے۔ اس وقت وہ سب مختلف

اقوال نوٹ کرلیے جاتے۔ اس کا التزام تھا کہ جب تک تمام شرکائے جلسہ جمع نہ ہولیں، کسی مسئلہ کو طے نہ کیا جائے۔

۲۔ اس فقہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی ضرورتوں اور تمدنی حاجتوں کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں اور قرنوں تک دو براعظموں کی وسعتوں کی مالک ہر حکومت کے شخصی اور ملکی قانون کا کام دیتی رہی۔

۳۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ امام صاحبؒ کی دقیق نظر نے مسائلِ فقہ کی دو قسمیں قرار دیں۔

الف: تشریعی احکام جو قرآن و سنّت سے ماخوذ ہیں۔

ب: وہ احکام جن کی طرف سے قرآن و سنت نے خاموشی اختیار فرمائی ہے اور جو تمدن و معاشرت کی ضرورتوں اور تہذیب و تمدّن کی ترقیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔

امام صاحبؒ کی نگاہ حقیقت شناس نے اس فرق کو محسوس کیا اور تدوینِ فقہ میں اس کو ملحوظ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس فقہ میں جو وسعت اور آزادی ہے وہ دوسری فقہوں میں نہیں ہے۔ حالانکہ تبلیغ رسالت سے جو احادیث متعلق ہیں اور جو احادیث اس سے متعلق نہیں ہیں دونوں میں فرق کرنا ایک بدیہی بات ہے۔ پہلی قسم کے احکام و مسائل کے متعلق یہ آیت ہے۔

مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ تم کو دیں اسے لو اور جس سے وہ باز رکھیں اس سے باز رہو۔

دوسری قسم کے احکام و مسائل کے متعلق خود حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْهُ
وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَّائِي فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ۔

(میں ایک آدمی ہی تو ہوں جب تم کو کسی چیز کا تمہارے دین کے متعلق (بحیثیت رسولؐ) حکم دوں تو اسے لو اور جب تم کو کسی چیز کا اپنی رائے سے حکم دوں تو میں ایک آدمی ہی ہوں"

غرض کہ قانون اور غیر قانونی احکام میں فرق وامتیاز ایک قانونی اور فقہی ضرورت تھی اور ہے جس کو فقہ حنفی میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۴۔ فقہ حنفی قرآن و سنّت کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے درایت پر مبنی ہے اور عقل کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ ان اہل علم میں سے ہیں جن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ احکام شریعت مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی ہے۔ لہذا انھوں نے ان حکمتوں اور مصلحتوں کو ہر جگہ ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن نے خود ان مصلحتوں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ مثلاً نماز فحش اور منکرات سے باز رکھتی ہے۔ روزے تم پر فرض کیے گئے۔ شاید کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو سکے۔ جہاد کے متعلق فرمایا: کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین کل کا کل اللہ کے لیے ہو جائے۔ غرض کہ عقل و درایت پر مبنی ہونا فقہ حنفی کی خصوصیت ہے اور امام صاحبؒ نے اس کو ملحوظ رکھ کر قرآن و سنت کا منشا پورا کیا ہے۔

۵۔ دوسری فقہوں کے مقابلہ میں یہ فقہ سہل اور آسان ہے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ یہ آیا ہے کہ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے تنگی اور سختی نہیں چاہتا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں آسان سہل شریعت لے کر آیا ہوں اور یہ خوبی فقہ کے تمام ابواب میں دوسری فقہوں کے تقابلی مطالعہ سے بہ آسانی محسوس ہو سکتی ہے۔

۶۔ چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ فقہ حنفی میں ذمیوں کو بڑی فراخی اور وسعت کے ساتھ حقوق دیے گئے ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جس کی نظیر کسی امام اور مجتہد کے مسائل میں نہیں ملتی۔

۷۔ وسعت اور ہمہ گیری بھی فقہ حنفی کی ایک خصوصیت شمار کی جاسکتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رح نے تراسی ہزار مسائل اپنی زبان سے بیان کیے جن میں سے اڑتیس ہزار عبادات سے متعلق ہیں اور پینتالیس ہزار معاملات سے تعلق رکھتے ہیں اور چھ لاکھ مسائل آپ نے مدوّن فرمائے۔

جہاد اور استقامت

امام صاحب نے ان تمام سیاسی تحریکوں کی حمایت کی جن سے آپ کو ذرا بھی اصلاح حال کی توقع ہوئی۔ چنانچہ زید بن علی رض (جو ۱۲۲ھ میں شہید ہوئے) نے ہشام بن عبدالملک کے عہد میں نفس زکیہ رح اور ان کے بھائی ابراہیم رح (جو ۱۴۵ھ میں شہید ہوئے) نے منصور عباسی کے عہد میں خروج کیا تو ہر ایک کا امام نے ساتھ دیا۔ زید بن علی رض کو دس ہزار کی رقم بھیجی۔ محمد نفس زکیہ رح کی بھی تائید کی اور ابراہیم بن عبداللہ رح کے مقابلہ سے حسن بن قحطبہ کو باز رکھا۔

مروان نے یزید بن عمرو بن ہبیرہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا جو نہایت مدبر، دلیر، فیاض اور صاحبِ اثر ہونے کے علاوہ شخصی اور خاندانی حکومت کا گورنر ہونے کی وجہ سے ظالم بھی تھا۔ اس نے پیشواؤں سے بھی حکومت کا کل پرزہ بن جانے کی خواہش کی، بلکہ ظلم و جبر سے کام لے کر انھیں مجبور کیا کہ حکومت کی مشینری میں فٹ ہو جائیں۔ امام صاحب رح نے انکار کیا۔ ابن ہبیرہ نے روزانہ دس درّے لگانے کا فرمان جاری کیا جس کی تعمیل کی گئی لیکن امام صاحب رح نے پھر بھی تسلیم نہیں کیا۔

آخر منصورؔ عباسی نے امام صاحبؒ کو نفس زکیہؒ اور ابراہیم بن عبداللہ کی تائید اور حمایت کرنے کی وجہ سے بغداد طلب کیا۔ ربیعؔ حاجب نے یہ کہہ کر امام صاحبؒ کو پیش کیا کہ یہ شخص آج دنیا کا سب سے بڑا عالم ہے منصورؔ نے قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس کا عہدہ پیش کیا۔ لیکن چونکہ حکومت شخصی اور شاہی تھی اور کئی پہلوؤں سے غیر اسلامی کردار کی حامل تھی، اس لیے امام صاحبؒ نے اس کا کل پرزہ بننا اور ظلم و ستم میں حصّہ دار ہونا گوارا نہ کیا اور صاف انکار کر دیا اور کہا میں اس کے قابل نہیں ہوں۔

منصورؔ نے کہا جھوٹ کہتے ہو۔ امام صاحبؒ نے فرمایا: پھر تو میں ہرگز عہدۂ قضا کے لائق نہیں ہوں اس لیے کہ جھوٹے آدمی کو ہرگز ایسا عظیم الشان عہدہ نہیں دینا چاہیے۔ منصورؔ لاجواب ہوگیا اور امام صاحبؒ کو قید میں ڈال دیا۔ ۱۴۶ھ میں آپ کو گرفتار کیا گیا۔ چار برس قید میں رہے۔ حتیٰ کہ ۱۵۰ھ میں آپ کا انتقال بھی قید خانہ ہی میں ہوا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ راجِعُونْ۔

کارنامے

۱۔ امام ابوحنیفہؒ کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے مدوّن اور مرتب اسلامی قانون فراہم کر کے حکومت کو بڑی حد تک غیر اسلامی بننے سے محفوظ کر دیا۔

۲۔ آپ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ فقہی مذہب فکر کی آپ نے بنیاد رکھی اور اصول اجتہاد کی اساس قائم کی اور اس سلسلہ میں اولیت کا مقام حاصل کیا۔

۳۔ آپ نے کلیات سے جزئیات اور اصول سے فروع مستنبط کرنے کا کام عملاً کیا اور اس حُسن و کمال کے ساتھ کیا کہ بعد کا ہر مجتہد آپ سے استفادہ کا محتاج ہے۔

۴۔ آپ نے فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور جاہلیت کے گردو

غبار سے اسلام کے چہرہ کو پاک صاف کیا۔

۵۔ آپ نے یہ سارا کام شاہی حکومت سے بالکل آزاد رہ کر کیا۔ حکومت کی امداد و اعانت کے بغیر کیا۔

۶۔ بلکہ یہ کام حکومت کی مداخلت اور بے جا دخل اندازی کے باوجود اس کے علی الرغم کیا۔

۷۔ آپ نے سیاست، معاشرت اور معیشت، دستور اور قانون ہر پہلو سے جیتے جاگتے معاشرہ کی اسلامی فقہی ضرورت کو اس طرح پورا کیا کہ کوئی خلا محسوس نہیں ہونے دیا۔

۸۔ آپ نے کچھ ایسی طرح ڈال دی کہ ائمۂ اربعہؒ کے بعد بھی اجتہاد و فقہ کا سارا کام درباروں کے دخل سے بالکل آزاد رہا۔

۹۔ اُن اصلاحی اور سیاسی تحریکوں کی تائید کی جن سے اصلاحِ حکومت کی توقع تھی۔

حضرت امام مالکؒ

ایک عظیم مجتہد

۹۳ھ تا ۱۷۹ھ

اسلام تمام قوموں، تمام طبقوں اور ساری روئے زمین کے لیے ہے۔ وہ کسی خاص قوم یا نسل کے لیے نہیں ہے نہ کسی زمانے کے لیے مخصوص ہے۔ ایسے ہمہ گیر دین کے لیے تجدید کرنے والوں، ملّت کی اصلاح کرنے والوں اور اجتہاد سے کام لے کر مسائل اور تفصیلی قانون مرتب کرنے والوں کے ایک سلسلہ کی ضرورت تھی۔

اصلاح و تجدید اور اجتہاد کی یہ ضرورت، کسی ایک مکتبِ فکر کے وجود میں آجانے اور اس کی بہترین کوششوں سے بھی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ رہتی دنیا تک رہنے والے دین، ترقی پذیر سلطنت اور روئے زمین پر پھیلی ہوئی ملّت کے لیے چند در چند مکاتب فکر کے وجود میں آنے کی ضرورت تھی اور ان کا وجود میں آنا فطری بھی تھا۔ چنانچہ یہ ضرورت اس طرح پوری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے حنفی مکتبِ فکر کے علاوہ مالکی، شافعی اور حنبلی وغیرہ مکاتب فکر کو وجود بخشا۔ ان فقہی مکاتب فکر میں مالکی مکتب فکر کو ایک خاص اور اہم مقام حاصل ہے:

تعارف

امام مالکؒ کا نام مالک، کنیت ابو عبداللہ اور لقب امام دار الہجرت ہے۔ آپ کے والد کا نام انس اور دادا کا نام بھی مالک ہے۔ آپ عربی النسل ہیں۔ بنو حمیر کی شاخ بنو اصبح سے آپ کا تعلق ہے۔ آپ کے پردادا ابو عامر نے ۳ھ میں اسلام قبول کیا تھا۔ آپ کے دادا مالکؒ ایک جلیل القدر تابعی تھے۔ جن جواں مردوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد سر کو ہتھیلی پر رکھ کر ان کی نعش مبارک کو دشمنوں کے نرغے سے اٹھا کر دفن کرنے کی خطرناک خدمت انجام دی تھی ان میں سے ایک آپ کے دادا مالکؒ بھی تھے۔

زمانۂ پیدائش

امام مالکؒ امام ابو حنیفہؒ سے ۱۳ برس بعد پیدا ہوئے سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ بنو امیہ کا عہد شباب تھا ولید بن عبدالملک کا عہد خلافت تھا۔ ولید کا دور فتوحات کا دورِ زرّیں ہے۔

ترکستان، سندھ، اسپین اور قسطنطنیہ چار اطراف میں مسلمان فوجیں مصروف جہاد تھیں اور قسطنطنیہ کے علاوہ ہر مقام پر فتح و کامرانی سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔ حضور صلعم سے تعلق اور نسبت کے پہلو سے صحابۂ کرامؓ کا دور ختم ہو رہا تھا اور یہ تابعین کا دور تھا اور علمی اعتبار سے یہ فقہائے کرام کا ابتدائی دور تھا۔

تعلیم

امام مالکؒ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم کی گود میں پایا۔ آپ کا گھر بھی اور آپ کا شہر مدینہ منورہ بھی علماء و فضلا کا مخزن تھا۔ حضورؐ کے صحابۂ کرام جو قرآن و سنّت کے ماہر تھے ان کا مسکن یہی شہر تھا۔ عہد نبویؐ اور اس کے بعد خلفائے ثلٰثہ کے دور میں دار الخلافہ بھی یہی شہر

رہا تھا یہیں سے احکام شرعیہ تمام دنیائے اسلام میں پھیلتے تھے۔ امام مالکؒ نے شوق و ذوق اور لگن سے علم حاصل کیا اِس طرح جو علم بہت سے سینوں میں محفوظ تھا امام مالکؒ نے اپنے سینہ میں جمع کرلیا۔ اسی لیے آپؒ کو امام دارالہجرت کا لقب زبان خلق سے عطا ہوا۔ امام صاحبؒ نے لڑکپن ہی میں علم حدیث حاصل کرنے کی قابلیت پیدا کرلی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں' میں نافعؒ کے پاس علم حدیث حاصل کرنے کے لیے آتا تھا تو لڑکا سا تھا[1]۔

علم قرآن و حدیث امام مالکؒ نے قرآن مجید کی قرأت اور تجوید مدینہ کے امام القراء نافع بن عبدالرحمٰن سے حاصل کی، جن کی قرأت پر آج دنیائے اسلام میں قرأت کا دارومدار ہے۔ علم حدیث کے بھی سب سے پہلے شیخ، حضرت نافع مولیٰ عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ نافع نے کامل ۳۰ برس حضرت ابن عمرؓ کی خدمت کی اور علم حدیث حاصل کیا۔ حضرت نافع جب تک زندہ رہے امام مالکؒ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے رہے۔ فن حدیث میں روایت مالک عن نافع عن بن عمرؓ سلسلۃ الذہب یعنی طلائی زنجیر کہلاتی ہے۔ امام مالکؒ نے مدینہ، مکہ، بصرہ، خراسان اور جزیرہ کے جن اساتذہ سے علم حاصل کیا ان کی تعداد کم از کم ۷۵ ہے جیساکہ شاہ ولی اللہؒ کی رائے ہے لیکن سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق ان کی تعداد ۹۴ تک پہنچتی ہے۔

علم فقہ امام مالکؒ نے فقہ کا علم بھی اگرچہ مختلف بڑے بڑے شیوخ علماء اور ماہرین سے حاصل کیا تھا لیکن خصوصیت سے شیخ الفقہہ

---

[1] حیات امام مالکؒ از سید سلیمان ندویؒ ص۷

امام ابوعثمان ربیعۃ الرائے سے یہ فن سیکھا اور اس میں مہارت پیدا کی۔ امام ربیعہ مسجد میں درس دیتے تھے۔ امام مالکؒ، امام حسن بصریؒ، شعبہؒ، امام اوزاعیؒ وغیرہ ان کے حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے۔[1]

تحصیل علم میں صبر

امام مالکؒ نے تحصیل علم میں بڑے مصائب جھیلے۔ فقر و محتاجگی کی وجہ سے چھت کی کڑیاں تک فروخت کرنا پڑا مگر تحصیل علم کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ امام مالکؒ کو حصول علم کے لیے اگرچہ سفر کی صعوبتوں کا مقابلہ کرنے کی نوبت پیش نہیں آئی، کیونکہ مدینہ خود ہی مخزن علم تھا۔ دیگر اسلامی شہروں کے شیوخ اور علمائے جب حج کے لیے آتے تھے تو مدینہ منورہ بھی آتے اس موقعہ سے امام صاحب خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ امام صاحب نے مدینہ ہی میں رہ کر علم میں کمال پیدا کیا اور یہ کمال بغیر محنت اور بغیر جانفشانی کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ نافع سے حدیث سیکھنے کا وقت ٹھیک دوپہر کا وقت متعین تھا چلچلاتی دھوپ میں شہر سے باہر بقیع میں، جہاں ان کا گھر تھا جاتے تھے۔ ابن ہرمزؒ سے علم حدیث حاصل کیا تو صبح کو ان کے گھر پہنچتے اور شام کو واپس ہوتے تھے۔ اس طرح مشقتیں جھیلی ہیں تب علم میں کمال حاصل ہو سکا۔

امام مالکؒ فرماتے بھی تھے کہ علم میں کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک طالب علم مبتلائے فقر ہو کر بھی طلب علم میں نہ لگا رہے۔ یعنی شوق، صبر اور استقامت کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔

تدریس و افتاء

امام مالکؒ کے اساتذہ کرام ابھی حیات تھے کہ امام صاحب نے

[1] حیات امام مالکؒ ص۱۲

مستفید ہونے والوں کا حلقہ قائم ہوگیا۔ آپ کے استاد امام ربیعۃ الرائے کا جب ۱۳۶ھ میں انتقال ہوگیا تب تو آپ فقہ و اجتہاد کے امام تسلیم کرلیے گئے۔

امام مالکؒ کے "دادا استاد" حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضورؐ کے بعد ساٹھ برس تک حدیث، فقہ، فتویٰ اور ارشاد کے مرکز بنے رہے۔ اس کے بعد حضرت نافع جو ابن عمرؓ کی خدمت اور شاگردی میں کامل تیس برس تک رہے تھے، ہر حیثیت سے اپنے استاد کے جانشین تھے۔ یہی مقام خود امام مالکؒ کو حضرت نافعؒ کے بعد حاصل ہوا۔

غیرتِ علم خلیفہ ہارون رشید بڑے جاہ و جلال، شان و شوکت اور کرّ و فر کا مالک تھا لیکن علم دین سے بھی شغف رکھتا تھا اور اہل علم کی قدردانی اور عزّت افزائی کرتا تھا۔ چنانچہ وہ جب مدینہ آیا تو اس نے امام صاحب سے علم حدیث حاصل کرنا چاہا۔ آپ نے فرمایا کل کا دن مناسب رہے گا۔ ہارون رشید منتظر رہا کہ امام صاحب دربار میں تشریف لائیں گے، لیکن امام صاحب اپنی مجلس ہی میں رہے۔ خلیفہ نے دریافت کیا تو فرمایا: علم کے پاس آیا جاتا ہے علم کسی کے پاس نہیں جاتا۔ آخر ہارون رشید خود ہی حاضر ہوا۔ لیکن اس نے خواہش کی کہ دیگر طلبا کو اس وقت علیحدہ کر دیجیے! آپ نے فرمایا شخصی فائدے کے لیے عام فائدے کا خون نہیں کیا جاسکتا۔

شہرت اور وسعت آپ کو دنیائے اسلام میں بڑی شہرت حاصل ہوئی اور آپ کے ذریعہ علم کی دولت بڑی وسعت کے ساتھ دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پھیلی۔ ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں براعظم اس زمانہ کی دنیا، آپ کے علم سے سیراب ہوئی۔ عرب، عجم

ترکستان، اندلس، ایشیائے کوچک ہر جگہ سے طالبان علم جوق در جوق آکر امام مالکؒ کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے اور علم سے سیراب ہو کر واپس جاتے اور پھر اپنے اپنے وطنوں میں علم کی نہریں جاری کرتے تھے۔ غرض کہ امام مالکؒ گیا تھے، ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔

حق گوئی و بیباکی

بنو عباس کے دور میں بیعت خلافت لیتے وقت یہ عہد لینے کا طریقہ بھی رائج رہا کہ جو شخص بیعت کرنے کے بعد توڑے اس کی بیوی کو طلاق۔ جبراً بیعت لینے کے سلسلہ میں یہ عہد انتہائی کارگر نسخہ تھا۔ علمی اعتبار سے امام مالکؒ کی رائے درست ہے کہ مجبور کی طلاق واقع نہیں ہوتی یا امام ابو حنیفہؒ کی رائے کہ جبری طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے، یہ الگ بحث ہے لیکن سیاسی اعتبار سے یقیناً امام مالکؒ کا فتویٰ جبر و ظلم اور شاہی ہتھکنڈوں کے خلاف ایک سخت احتجاج اور کامیاب ہتھیار تھا۔ مدینہ کا گورنر جعفر بن سلیمان جو خلیفہ منصور کا چچا زاد بھائی تھا، اس نے امام صاحب کو یہ حکم دیا کہ وہ یہ فتویٰ ہرگز نہ دیں مگر امام صاحب نے علی الاعلان حق کا اظہار کیا اور کوڑوں کی سزا برداشت کی، چنانچہ امام مالکؒ کو جبراً لایا گیا کپڑے اتارے گئے اور انتہائی درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ننگی پیٹھ پر پوری شدت کے ساتھ ستر کوڑے مارے گئے آپ کے ہاتھ اس قدر کس کے باندھے گئے کہ شانے اتر گئے پھر ظالموں نے آپ کی اس طرح تشہیر کی کہ اونٹ پر بٹھا کر ایک مجرم کی حیثیت سے شہر میں گشت کرایا گیا۔ اس حالت میں بھی امام صاحبؒ اعلان حق سے باز نہیں رہے۔ بلند آواز سے کہتے جاتے کہ میں مالک بن انس ہوں، میں نے فتویٰ دیا ہے کہ جبری طلاق واقع نہیں ہوتی۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی " اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

فقۂ مالکی کی خصوصیات

امام مالکؒ کا سب سے بڑا کارنامہ فقہ و اجتہاد اور علمی و فکری رہنمائی ہے۔ آپ کی تصانیف یا جو کتابیں آپ کی طرف منسوب ہیں وہ یہ ہیں۔

موطا[1]، رسالہ[2] بنام ہارون رشید، احکام[3] القرآن، المدونہ[4]، رسالہ[5] بنام ابن مطرف، رسالہ[6] بنام ابن وھب، کتاب[7] الاقضیہ، کتاب[8] المناسک، تفسیر[9] غریب القرآن، کتاب[10] المجاسات، تفسیر القرآن[11]۔

آپ نے جو علمی و فکری رہنمائی اور فقہ و اجتہاد کا کارنامہ انجام دیا ہے اس کی خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ امام صاحب نے اپنی فقہ میں "تعامل مدینہ" کو پیش نظر رکھا ہے۔

۲۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے جن احادیث پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے، وہ اگرچہ اکثر و بیشتر "مرسل ہیں مگر ان کی سند بہت مختصر ہے اور طلائی زنجیر کہلاتی ہے۔

۳۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے قیاس و اجتہاد سے کم اور ظاہر روایت سے زیادہ کام لیا ہے۔

کارنامے

آپ کے کارنامے تقریباً وہی ہیں جو امام ابو حنیفہؒ کے ہیں۔

۱۔ کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے ایک مجموعۂ قوانین مرتب کرنے کی کوشش فرمائی۔ فقہ و اجتہاد کے ذریعہ دنیائے اسلام کی علمی و فکری رہنمائی فرمائی۔

۲۔ دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ایسے اصول اور بنیادیں قائم کردیں جن پر فقہ و اجتہاد کا کام کئی صدیوں تک ہوتا رہا۔ آپ کے اصول پر بعد کے

فقہانے مزید کام کیا اور اسلامی قانون کا ایک خاص اور اہم مکتب فکر وجود میں آگیا، مغربی اسلامی دنیا کے بیشتر مسلمان جس پر کاربند تھے اور ہیں۔

۳۔ تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ یہ کام انتہائی حق گوئی و بے باکی کے ساتھ انجام دیا، شاہی دباؤ کے علی الرغم اور اس سے بالکل بے نیاز ہو کر انجام دیا۔

۴۔ چوتھا کارنامہ یہ ہے کہ حکومت کے جابرانہ کردار کے خلاف فتویٰ دیا اور اس کے نتیجہ میں سخت مصائب جھیلے۔

وفات امام مالکؒ زندگی بھر خدمت دین میں مصروف رہے۔ آخر مہلت عمر پوری ہوگئی اور تین ہفتہ بیمار رہنے کے بعد ۱۱ ربیع الاوّل ۱۷۹ھ کو دار فانی سے دار بقا کی طرف روانہ ہو گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

امام شافعیؒ

ایک عظیم مجتہد

۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ

امام مالکؒ کے بعد اور امام احمد بن حنبلؒ سے پہلے جس عظیم فقیہہ اور مجتہد کو وجود بخشا گیا وہ امام شافعیؒ ہیں۔ آپ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے دیگر تمام فقہا اور مجتہدین میں ممتاز ہیں۔

نام و نسب آپ کا نام محمد ہے، آپ کے والد کا نام ادریس ہے۔ آپ کے دادا کا نام عباس، پر دادا کا نام عثمان اور دادا کے دادا کا نام شافع ہے۔ انھیں شافع کی طرف نسبت سے شافعی کہلاتے ہیں۔ آپ کی والدہ یمن کے قبیلہ ازد سے تھیں اور بڑی ذہین تھیں۔

آپ عسقلان کے صوبے میں غزہ نامی مقام پر ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ادریس کا انتقال غزہ ہی میں ہوا۔ آپ کی والدہ دو سال بعد آپ کو آپ کے آبائی وطن مکہ معظمہ لے آئیں اور یہیں آپ نے یتیمی کی حالت میں اپنی والدہ کی سرپرستی میں پرورش پائی۔

تعلیم و تربیت آپ نے مکہ معظمہ میں بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ ایک دیہات بنو ہذیل میں رہ کر عربی زبان میں کمال پیدا

گیا۔ پھر مکہ معظمہ واپس تشریف لائے اور مفتی حرم مسلم بن خالد زنجی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ آپ مفتی حرم کی شاگردی میں رہے۔ حتیٰ کہ انھوں نے آپ کو فتویٰ دینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ پھر آپ مفتی حرم کا سفارشی خط لے کر مدینہ منورہ امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ موطا حفظ کر چکے تھے۔ امام مالکؒ کے سامنے آپ نے موطا پڑھی تو موصوف نے آپ کی قرأت کو بہت پسند فرمایا۔

آپ نے محدث مدینہ امام مالکؒ کے علاوہ محدث مکہ حضرت سفیان بن عُیَینہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ مفتی حرم مسلم بن خالد کے علاوہ آپ نے امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن الحسنؒ سے علم فقہ حاصل کیا اس لیے آپ حجاز کے علم حدیث اور عراق کے علم فقہ دونوں کے جامع اور ماہر بن گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ ایک طرف اگر حجازی اور عراقی علم حدیث و فقہ کے ماہر تھے تو دوسری طرف بدوی فصاحت اور بلاغت کے بھی مالک تھے! ادب و انشا میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ مباحثہ اور مناظرہ میں دوسروں پر غالب رہتے تھے۔ خوبی تحریر اور حسن بیان کا ملکہ رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے بہترین انشاء پرداز اور ادیبوں کے ہمسر تھے۔ آپ کی تحریریں اپنے ادب اور انشاء کے پہلو سے جاحظ جیسے مشہور فنکار کے ادب سے کسی طرح کم درجہ نہیں رکھتی ہیں۔

علم و کمال

امام شافعیؒ اپنے زمانے کے علوم و فنون میں پوری پوری مہارت کے مالک تھے۔ لغت اور زبان کے پہلو سے بھی آپ اونچا مقام رکھتے تھے۔ علم لغت اور نحو کے امام عبدالملک ابن ہشام کا قول ہے، امام شافعیؒ کو لغت میں اتنا اونچا مقام حاصل ہے کہ آپ حجت اور سند ہیں۔ بلکہ ابن ہشام خود زبان و ادب کی گتھیاں سلجھانے میں امام شافعیؒ سے مدد لیتے

تھے۔ ابوعبیدہ اور ایوب ابن سوید دونوں لغت کے امام ہیں اور دونوں کا کہنا ہے کہ زبان و ادب امام شافعیؒ سے سیکھنا چاہیے۔ اصمعی کا قول ہے کہ بنو ہذیل کے اشعار کی تصحیح میں نے شافعیؒ سے کی۔ غرض یہ کہ امام شافعیؒ کو زبان و ادب میں استادانہ مہارت حاصل تھی۔ آپ کو سیکڑوں اشعار یاد تھے اور بات بات میں شعر پیش کیا کرتے تھے۔ خود بھی اشعار کہتے تھے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اَلْجِدُّ يُدْنِيْ كُلَّ اَمْرٍ شَاسِعٍ
وَالْجِدُّ يَفْتَحُ كُلَّ بَابٍ مُغْلَقٍ

یعنی جدوجہد سے ہر مشکل آسان ہوتی ہے اور محنت و مشقت سے ہر بند دروازہ کھل جاتا ہے۔

كُلَّمَا اَدَّبَنِي الدَّهْرُ اَرَانِيْ نَقْصَ عَقْلِيْ
وَاِذَا مَا ازْدَدْتُ عِلْمًا زَادَنِيْ عِلْمًا بِجَهْلِيْ

یعنی زمانہ نے جو کچھ علم و حکمت مجھے سکھایا، جو کچھ تجربہ میں نے حاصل کیا، جس قدر میرے علم میں اضافہ ہوا اس سے اپنی عقل کا نقص اور جہل ہی مجھ پر منکشف ہوتا گیا۔

زبان و ادب کے علاوہ فقہ اور حدیث میں آپ کا جو مقام ہے وہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ آپ ابھی پندرہ ہی سال کے تھے کہ آپ کے استاد امام اور مفتی مکہ مسلم ابن خالدؒ نے کہہ دیا تھا "شافعی! اب تم فتویٰ دیا کرو۔ بخدا اب تم فتویٰ دینے کے قابل ہو گئے ہو۔" علم حدیث میں آپ کی مہارت اور شہرت کا یہ حال ہے کہ عراق میں آپ کا لقب ناصر الحدیث مشہور تھا۔ آپ کا علمی مقام آپ کی تصانیف، فقہی کاوشوں اور مجتہدانہ کارناموں سے خود بخود ظاہر ہوتا ہے۔ آپ

پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اصول فقہ میں باقاعدہ تصنیف چھوڑی ہے۔ آپ کی طرف جو کتابیں منسوب ہیں ان کی تعداد ۱۱۳ تک بتلائی جاتی ہے مشہور تصانیف یہ ہیں۔

(۱) کتاب الامّ پندرہ جلدوں میں (۲) جامع کبیر مزنی (۳) جامع صغیر مزنی (۴) مختصر ربیع (۵) مختصر بُویطی (۶) کتاب الحرملہ (۷) کتاب الحجہ (۸) الرسالہ (۹) الامالی (۱۰) مسند شافعیؒ۔

اقوال زرّیں آپ کی جلالت شان کا اندازہ آپ کے اقوال سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

(۱) طلب علم نفل نماز سے بہتر ہے۔

(۲) طالب دنیا اور طالب عقبیٰ دونوں کو علم حاصل کرنا چاہیے۔

(۳) قرب خداوندی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ادائیگی فرائض کے بعد تحصیل علم ہے۔

(۴) علم کا مزہ اسے آتا ہے جس نے تنگ دستی کے باوجود علم حاصل کیا ہو۔

(۵) تقویٰ اور بردباری علم کا زیور ہیں۔

(۶) جس پر دنیا کی محبت غالب ہوتی ہے وہ اہل دنیا کا غلام ہوتا ہے۔

(۷) فلاح دارین کے پانچ اصول ہیں۔ استغناء۔ دل دکھانے سے پرہیز۔ حلال روزی۔ پرہیزگاری۔ توکل علی اللہ۔

(۸) اگر چاہتے ہو کہ اللہ تمہارا دل روشن فرمادے تو غیر ضروری گفتگو سے بچو گناہوں سے دور رہو اور کوئی نہ کوئی ایسا عمل خیر ضرور کیا کرو جس کا علم خدا کے علاوہ کسی کو نہ ہو۔

(۹) تم ہر ایک کو خوش نہیں کرسکتے لہٰذا ہر کام میں خلوص و للہیت پیش نظر

رکھو۔

(۱۰) انسان کی تعلیم و تربیت جانوروں کو سدھانے سے زیادہ مشکل ہے

(۱۱) جو تم سے غیبت کرتا ہے وہ تمہاری بھی غیبت کرے گا۔ دمَنْ نَمَّ لَکَ نَمَّ بِکَ) ع

ہر کہ عیب دگراں پیش تو آورد و شمرد
بیگماں عیب تو پیش دگراں خواہد برد (سعدیؒ)

(۱۲) ایمان تین چیزوں سے مکمل ہوتا ہے۔ ۱۔ بھلے کام کرنا اور ان کا حکم دینا۔ ۲۔ بُرے کاموں سے پرہیز کرنا اور دوسروں کو ان سے باز رکھنے کی کوشش کرنا۔ ۳۔ حدود الٰہی کی نگہداشت کرنا۔

فقہ شافعی کی خصوصیات

اہل سنّت والجماعت کے مشہور فقہی مذاہب کے دو رُخ ہیں ایک عراقی مدرسہ فکر جس کو اہل الرائے کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے جو ایک طرح کی زیادتی ہے۔ دوسرا حجازی مدرسہ فکر جو اہل الحدیث کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو ایک طرح کی زیادتی ہی ہے۔ لوگ اسے اہل الظاہر کا نام بھی دیتے ہیں، اور یہ بھی ایک طرح کی زیادتی ہی ہے۔ امام شافعیؒ کی فقہ ایک حدیث سے ان دونوں رخوں کے درمیان راہ اعتدال یا سنگم کی حیثیت رکھتی ہے۔ شافعی فقہ کی یہ ایک خصوصیت ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ امام شافعیؒ ظاہر قرآن سے استدلال کرتے ہیں یہاں تک کہ کسی دلیل سے ثابت ہو جائے کہ ظاہری معنی مراد نہیں ہیں۔ اس کے بعد ان کے نزدیک حدیث کا درجہ ہے وہ ثقہ راوی کی خبر واحد پر عمل کرنے کی سخت حمایت کرتے ہیں اور جب حدیث کا سلسلہ رسول اللہ صلعمؐ تک متصل ہو جائے تو امام مالکؒ کی طرح حدیث کے لیے کسی ایسے عمل کی شرط نہیں لگاتے

جو حدیث کی تائید میں ہیں اور نہ امام ابو حنیفہ رح کی طرح حدیث کے مشہور ہونے کی شرط لگاتے ہیں۔ امام شافعی رح صحیح حدیث کو وہی درجہ دیتے ہیں جو قرآن کا ہے۔ وہ دونوں کو واجب الاتباع قرار دیتے ہیں۔ حدیث کے بعد وہ اجماع پر عمل کا حکم دیتے ہیں۔ اور اجماع کے بعد قیاس پر عمل کرنے کا۔ اس سلسلہ میں وہ اور امام ابو حنیفہ رح بنیادی طور پر بالکل متفق اور متحد الخیال ہیں۔ فقہ شافعی میں استدلال کا اصول بھی موجود ہے جو حنفیوں کے اصول استحسان اور مالکیوں کے اصول استصلاح سے ملتا جلتا ہے۔ ایک تیسری خصوصیت اس فقہ کی یہ ہے کہ تقریباً ہر اہم مسئلہ میں دو قول پائے جاتے ہیں۔ ایک قدیم دوسرا جدید یا ایک عراقی اور دوسرا مصری مسلک کہلاتا ہے۔ اصل میں ہر محقق اگر وہ مخلص ہے تو تحقیق اور تفتیش کے دوران اگر اس کو اپنی تحقیق میں کوئی کمزوری نظر آتی ہے تو وہ برملا اس کو تسلیم کر لیتا ہے اور تحقیق کے بعد جو رائے قائم کرتا ہے اس کا اظہار اور اعلان کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ تقریباً سب ہی فقہائے کرام کے یہاں یہ چیز موجود ہے لیکن فقہ شافعی کی وہ ایک نمایاں خصوصیت ہے چوتھی خصوصیت اس فقہ کی یہ ہے کہ اس میں حدیث مرسل اور منقطع پر عمل کرنے میں اس قدر پابندیاں عائد کی گئی ہیں کہ مرسل اور منقطع حدیث پر عمل ترک ہو گیا ہے۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ امام شافعی رح نے مختلفات کو جمع کرنے اور ان میں تطبیق دینے کے اصول مرتب فرمائے۔ چنانچہ اس فقہ میں ان اصولوں سے خوب کام لیا گیا ہے۔ چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رائے اور قیاس میں فرق کیا گیا ہے۔ کسی حکم شرعی کی علت کسی خیالی حرج یا مصلحت کو قرار دینا رائے ہے اور قیاس یہ ہے کہ کسی حکم منصوص سے علت اخذ کی جائے اور حکم کا دار و مدار اسی پر رکھا جائے۔

لیکن درحقیقت یہ فرق ہر ایک فقیہہ اور امام نے ملحوظ رکھا ہے۔ فقہ رائے کو قیاس کے بجائے کسی نے بھی اختیار نہیں کیا۔

کارنامے

امام شافعیؒ سے پہلے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ جو کارنامے انجام دے چکے تھے وہ کچھ اس طرح تھے۔

۱۔ فقہی مذہب فکر کی بنیاد رکھی اور اصول اجتہاد کی اساس قائم کی۔

۲۔ کلّیات سے جزئیات اور اصول سے فروع مستنبط کیے۔

۳۔ فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

۴۔ جاہلیت کے گرد و غبار سے اسلام کا چہرہ صاف کیا۔

۵۔ عبادات، معاشرت، معیشت، سیاست، دستور اور قانون ہر پہلو سے جیتے جاگتے معاشرہ اور ترقی پذیر حکومت کی ضرورت کو اس طرح پورا کیا کہ کوئی خلا محسوس نہیں ہونے دیا۔

۶۔ ایسے اصول اور بنیادیں قائم کیں جن پر فقہ و اجتہاد کا کام کئی صدیوں تک ہوتا رہا۔

امام شافعیؒ کے بھی یہی کارنامے ہیں۔ آپ نے اس کام کو جو آپ سے پہلے کے دونوں عظیم مجتہد انجام دے چکے تھے مزید تقویت پہنچائی۔ اسے آگے بڑھایا، اس میں نکھار پیدا کیا، اسے بام عروج پر پہنچایا۔

۷۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اجتہاد کے کام میں آپ اس طرح منہمک ہوئے کہ جہاد کا آپ کو قطعاً موقع نہیں ملا۔ لیکن جہاد اگر صرف جہاد بالسیف کا نام ہے تو واقعی آپ کو اس کا موقعہ نہیں ملا۔ لیکن قلمی جہاد تو آپ نے برابر کیا، علمی جہاد میں تو آپ نے زندگی کھپا دی۔ سیاسی سطح پر جو خرابیاں رونما ہو گئی تھیں اور حکومت و خلافت میں جو غیر اسلامی جراثیم پیدا

ہو گئے تھے ان کی اصلاح اور انسداد کے لیے فقہائے کرام اور علمائے عظام نے دو طریقے اختیار کیے تھے۔ ایک طریقہ تو وہ تھا جو امام ابو حنیفہ رح اور امام احمد بن حنبل رح اور امام سفیان ثوری رح جیسے لوگوں نے اختیار کیا تھا کہ حکومت اور خلافت سے کوئی سروکار نہیں رکھا، نہ عہدے قبول کیے اور نہ وظائف اور تحفے قبول کیے۔ اس طرح ان حضرات نے قطع تعلق کے ذریعہ حکومت کے غیر شرعی رُخ کے خلاف خاموش عملی احتجاج کیا۔ دوسرا طریقہ وہ تھا جو امام ابو یوسف رح جیسے لوگوں نے اختیار کیا کہ حکومت اور حکام سے ربط و ضبط رکھا جائے اور میل جول قائم کر کے ان کی اصلاح کی فکر کی جائے۔ یہی دوسرا طریقہ امام شافعی رح نے اختیار فرمایا تھا۔ چنانچہ ہارون رشید کے زمانے میں نجران کے عامل مقرر ہوئے۔ اس منصب پر فائز ہوتے ہوئے بھی یمن کے گورنر کے ظلم و ستم پر آپ نے تنقید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک اہل بیت کی ہمنوائی کے الزام میں معزول کیے گئے اور گرفتار کر کے ہارون رشید کے سامنے پیش کیے گئے اور امام محمد بن حسن رح کی سفارش پر الزام سے بری قرار دے کر رہا کر دیے گئے۔

غرض کہ حکومت و سیاست کے پہلو میں بھی اصلاح و تجدید کی فکر سے آپ غافل نہیں رہے۔ یہ بھی آپ کا ایک کارنامہ ہے کہ آپ نے ہمہ جہتی اصلاح کی کوشش فرمائی۔ آٹھواں کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے شریعت کے اصل ماخذ قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرنے کا صور پھونکا اور تحریک چلائی جو کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

وفات آخر علم و ادب، فقہ و اجتہاد اور اصلاح و تجدید کے اس باعظمت بزرگ کا بھی وقت آپہنچا۔ ۵۴ سال کی عمر تھی کہ مصر میں ۳۰ رجب ۲۰۴ھ کو بعد نماز مغرب جمعہ کی شب میں وفات پائی اور جمعہ کے دن بعد عصر

تدفین عمل میں آئی۔ مزار ہے نام اللہ کا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جلالت شان

معاصرانہ چشمک ایک کھلی ہوئی اور عام حقیقت ہے لیکن امام شافعیؒ پر اگرچہ کیچڑ اچھالنے والوں نے کیچڑ بھی اچھالی اور علمائے سوء نے آپ کو مصیبتوں میں بھی مبتلا کرایا تاہم آپ کے ہمعصر بڑے بڑے علماء اور ائمۂ وقت آپ کی جلالت شان کے اعتراف میں رطب اللسان ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں۔ شافعی دنیا کے لیے مثل آفتاب کے ہیں۔ ایسی اہمیت کے مالک ہیں جیسے جسم کے لیے صحت۔

قاسم بن سلام کا قول ہے۔

"میں نے شافعیؒ سے زیادہ کسی کو کامل نہیں پایا۔"

حضرت سفیان بن عیینہؒ سے جب کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو فرماتے اس نوجوان (شافعیؒ) سے پوچھ لو۔

آپ کے بھانجے ابو محمد کہتے ہیں۔ ہمارے ماموں رات رات بھر مطالعہ فرماتے رہتے۔ آخر شب میں عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

ابو حسان کہتے ہیں۔ میں نے امام محمد بن حسنؒ کو امام شافعیؒ کی تعظیم سے زیادہ کسی کی تعظیم کرتے نہیں دیکھا۔ ان کو آتا دیکھ کر سواری سے اتر پڑتے اور انتہائی ادب و احترام کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ سے روایت ہے کہ امام شافعیؒ تیسری صدی کے مجدد ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ

امام شافعیؒ کے بعد اصلاح امت اور احیاء دین کے فریضہ کی ادائیگی کے لیے جس عظیم مصلح اور مجدد کو وجود بخشا گیا وہ امام احمد بن حنبلؒ ہیں۔ آپ ایک طرف اگر ایک عظیم محدث ہیں تو دوسری طرف ایک عظیم فقیہہ بھی ہیں اور تیسری طرف ایک عظیم مصلح اور مجدد بھی ہیں۔

نام ونسب آپ کا نام احمد ہے والد کا نام محمد اور دادا کا نام حنبل بن ہلال تھا۔ آپ ۱۶۴ھ میں ربیع الاول کے مہینے میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ آپ خاندانی اعتبار سے شیبانی ہیں۔ بنو شیبان بصرہ میں آباد تھے لیکن آپ کے دادا وہاں سے منتقل ہو کر خراسان چلے آئے تھے اور بنو امیہ کے عہد میں سرخس کے گورنر تھے۔ خراسان میں جب عباسی دعوت بلند ہوئی تو اس کے داعیوں میں شامل ہو گئے، کیونکہ وہ اسے حق سمجھتے تھے۔ آپ کے نانا بھی بنو شیبان کے سرداروں میں سے تھے، کریم اور سخی تھے! ان کا دروازہ مہمانوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔

امام احمد ماں اور باپ دونوں طرف سے شریف اور نجیب تھے! ان کی رگوں میں ایک شریف اور خوددار باپ کا خون گردش کر رہا تھا۔ ہمت وعزم اور صبر وتحمل اور ایمان راسخ جیسے اعلیٰ اوصاف آپ کو ورثے میں ملے تھے۔

تعلیم و تربیت

کہتے ہیں "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ چنانچہ امام صاحب بچپن ہی سے ہونہار تھے۔ آپ کے ایک چچا تھے جو حاکم بغداد کو شہر کی خبریں فراہم کرتے تھے۔ پرچہ نویسی پر مقرر تھے۔ ایک روز حاکم بغداد نے وجہ دریافت کی کہ آج کی خبریں کیوں نہیں بھیجیں۔؟ آپ کے چچا نے جواب دیا خبر بس تو میں اپنے بھتیجے احمد کے ہاتھ بھیج چکا تھا۔ چنانچہ آپ کو بلایا گیا۔ آپ ابھی بالکل نوخیز تھے۔ چچا نے پوچھا میں نے تمہارے ہاتھ خبریں بھیجی تھیں؟ جی ہاں بھیجی تو تھیں۔ پھر وہ کاغذات تم نے کیا کیے؟ آپ نے کہا وہ میں نے پانی کی نذر کر دیے۔ حاکم نے جب سنا تو کہا، یہ لڑکا اس قدر تقویٰ سے کام لیتا ہے تو ہم کیوں نہ ایسا کریں۔ معلوم ہوا کہ حکام وقت اور دربار خلافت سے آپ کے خاندان کے تعلقات برابر قائم تھے لیکن آپ لڑکپن ہی سے اس روش کو پسند نہیں کرتے تھے اور شبہات سے دور بھاگتے تھے۔ یہ آپ کی والدہ کی تربیت کا اثر تھا۔

آپ نے یتیمی میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالتے ہی اپنے کو تنہا محسوس کیا۔ وہ خود فرماتے ہیں "میں نے اپنے والد اور دادا کسی کو نہیں دیکھا"۔ آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت کا بوجھ اٹھایا۔ باپ دادا نے آپ کو بالکل خالی ہاتھ نہیں چھوڑا تھا بلکہ گذر بسر کے لائق بغداد میں کچھ جائداد تھی جس کی آمدنی سے آپ کی والدہ نے آپ کو پالا پوسا اور آپ کی تعلیم و تربیت کا فریضہ ادا کیا۔

امام احمدؒ میں پانچ ایسی چیزیں جمع ہو گئی تھیں کہ جس شخص میں بھی وہ جمع ہو جائیں وہ ہمیشہ بلند کردار کا مالک بنتا ہے، گھٹیا کاموں سے دور بھاگتا ہے اور بلندیوں کا طالب رہتا ہے (۱) حسب و نسب کا شرف (۲) یتیمی (۳) عیش و

عشرت اور فقر و فاقہ کے درمیان معتدل معاشی حالت۔ یہ قناعت اور فکر و نظر میں بلندی کا جذبہ یہ تقویٰ اور پرہیزگاری لے۔ آپ کو تعلیم و تربیت بھی ایسی ملی جس نے ان قدرتی خوبیوں میں چار چاند لگا دیے۔

امام احمدؒ نے ابتدائی تربیت اپنی والدہ محترمہ کے علاوہ بغداد کے علماء اور محدثین سے حاصل کی۔ بغداد عالم اسلام کا دارالخلافہ تھا، ہر علم و فن کے باکمال اور ماہرین یہاں جمع تھے۔ آپ کا خاندان آپ کو بچپن ہی سے ایک بڑا عالم دین بنانے کا خواہشمند تھا۔ حسن اتفاق کہ خود امام صاحب کا طبعی رجحان بھی دینی علوم ہی کی طرف تھا۔ آپ نے بہت جلد قرآن پاک حفظ کرلیا۔ پرہیزگاری اپنی پوری آن بان کے ساتھ بچپن.. سے جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک آپ کے اندر قائم رہی بلکہ برابر پروان چڑھتی رہی۔ حفظ قرآن اور عربی زبان کے بعد آپ نے خوشنویسی کی طرف توجہ فرمائی۔ آپ کے تقویٰ اور تحریر میں آپ کی مہارت کی وجہ سے عورتیں اپنے شوہروں کو خطوط آپ ہی سے لکھواتی تھیں۔ حالانکہ آپ ابھی لڑکے ہی تھے مگر آپ نے کبھی ایسی ویسی بات اپنے قلم سے نہیں لکھی۔ ایک بار ہارون رشید اپنی فوج لیے رقہ میں مقیم تھا، بغداد میں فوجیوں کے خطوط ان کی بیوی کے نام آتے تھے تو امام احمد ہی سے وہ خطوط پڑھواتی تھیں اور جواب لکھواتی تھیں۔ امام صاحب کے لڑکپن میں ان کے ہم عمر لڑکے اور ان لڑکوں کے باپ دونوں آپ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

لے اس مضمون کی ترتیب میں میرے پیش نظر استاد ابوزہرہ کی کتاب امام احمد بن حنبلؒ کا اردو ایڈیشن رہا ہے۔

علامہ ہشیم بن جمیلؒ نے آپ کے بچپن ہی میں آپ کی فطری صلاحیتوں اور اعلیٰ خصلتوں سے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ بچہ کیا سے کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا تھا: "یہ لڑکا اگر زندہ رہا تو اپنے زمانے کے لیے حجت ہوگا"

راہ علم میں

امام احمدؒ نے اپنی جوانی میں جب علم حدیث کی طرف خصوصی توجہ کی تو سب سے پہلے بغداد کے محدثین سے علم حدیث حاصل کیا مگر آپ کا عزم آپ کو عراق، شام اور حجاز ہر جگہ لے گیا۔ چنانچہ آپ کی کتاب مُسند میں حجازی، شامی، کوفی اور بصری علماء سے حاصل کی ہوئی حدیثیں ایک تناسب کے ساتھ موجود ہیں۔ ۱۷۹ھ سے ۱۸۶ھ تک آپ نے بغداد میں علم حاصل کیا۔ اس کے بعد بصرہ، حجاز اور یمن تشریف لے گئے اور جہاں جس قدر ضرورت محسوس فرمائی اسی قدر وہاں قیام فرما کر اپنا دامن علم کے موتیوں سے بھر لیا۔ چنانچہ پانچ مرتبہ بصرہ اور پانچ ہی بار حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ آپ نے تین حج پیدل کیے اور یہ شاید اس لیے کہ روپیہ پیسہ آپ کے پاس کم تھا۔ نیز راہ خدا میں مشقت جھیلنا بھی آپ کار ثواب خیال کرتے تھے۔

آپ فرماتے تھے۔

"اگر میرے پاس اتنی رقم ہوتی تو میں حدیث کی سماعت کرنے جریر بن عبدالحمید کے پاس رے ضرور جاتا۔ ہمارے کچھ ساتھی گئے لیکن خالی ہاتھ ہونے کی وجہ سے میں نہ جا سکا۔" آپ یہ بھی فرمایا کرتے۔ "میں اس وقت تک علم حاصل کرتا رہوں گا جب تک قبر میں نہ پہنچ جاؤں۔"

امام احمد بن حنبلؒ جامعِ اوصاف تھے۔ وہ کون سی اخلاقی خوبی ہے جس سے آپ نے اپنی زندگی کو مزین نہ کیا ہو۔ آپ نے صاحب خلق عظیم

صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے اپنی زندگی کو اخلاقی اور روحانی کمالات سے مالا مال کر لیا تھا۔ اس طرح آپ کی زندگی جامع اوصاف بن گئی تھی۔ پھر بھی آپ کے اندر کچھ خصوصی اوصاف تھے جن نمایاں خوبیوں سے آپ کی زندگی مزین تھی وہ یہ ہیں۔

شانِ بے نیازی

دنیا کی دولت سے بے نیازی، فقر و زہد کی شان اور اکل حلال کا اہتمام آپ کی ایک عظیم خوبی اور نمایاں صفت ہے جس سے آپ کی زندگی میں ایک عجیب دلکشی اور نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ اکل حلال کا اس قدر اہتمام تھا کہ جس روزی میں ذرا بھی شبہ ہوتا اسے فوراً ترک کر دیتے۔ آپ کی ایک جائداد تھی جس سے کچھ گزر بسر ہو جاتی تھی۔ کسی نے اس کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا۔ یہ مکان اور جائداد مجھے اپنے والد سے ورثے میں ملی ہے۔ اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ یہ اس کی ہے تو میں اس سے فوراً دست بردار ہو جاؤں گا اور جائداد اس کے سپرد کر دوں گا۔ استاذ ابو زہرہ کے بقول یہ تھوڑی سی آمدنی جس پر وہ صبر و شکر کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور کسی سے کچھ لینا پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ حالات زیادہ نازک ہو گئے ہیں اور فاقے کی نوبت آگئی ہے پھر بھی آپ نے کسی سے کچھ لینا پسند نہیں کیا، حتیٰ کہ آپ کو کبھی کبھی ایسا بھی کرنا پڑا کہ کھیت کٹ جانے کے بعد گرا پڑا غلہ چنا اور اکٹھا کر کے کام میں لائے۔ یہ ایک جائز ذریعہ تھا کیونکہ مالکان کی طرف سے اس کی اجازت ہوتی تھی کہ جو چاہے چن کر لے جائے لیکن یہ آپ اسی وقت کرتے تھے جب کہ محنت مزدوری کا بھی موقعہ نہ ہوتا تھا۔ راہ علم میں آپ نے باربرداری اور حمالی کا کام کر کے بھی مزدوری حاصل کی ہے کبھی لکھنے کا کام کیا اور روزی [illegible]مل کی ہے۔ آپ نے ازاربند

بُن کر بھی حلال روزی حاصل کی ہے۔ یہ تھا معاش کے معاملہ میں آپ کا طریقہ اس شان بے نیازی میں نفس کی بلندی ہے، طبیعت کی پاکیزگی ہے ہمت و حوصلہ ہے، سرفرازی اور ہر دلعزیزی ہے۔

عملی احتجاج امام احمد بن حنبلؒ نے خلافت سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے اور کسی قسم کی امداد قبول نہ کرنے کا طریقہ اپنایا تھا۔ ان کی نظر میں خلافت اپنے غیر اسلامی کردار کی وجہ سے عملاً فقط چنگیزی بن کر رہ گئی ہے۔ کیوں کہ اس وقت انتخاب خلیفہ کے اسلامی طریقہ کے بجائے ولی عہدی سسٹم رائج تھا جو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی نہیں، قیصر و کسریٰ کی سنت تھی۔ تمام امت میں سے صالح ترین آدمی کا انتخاب کرنے کے بجائے ایک ہی خاندان میں حکومت و سلطنت کی سربراہی کو مخصوص کر دیا گیا تھا جو اسلامی سلطنت کا نہیں، خاندانی حکومت کا رنگ ڈھنگ ہے۔ دین قائم کرنا اور اللہ کا کلمہ بلند کرنا حکومت کا نصب العین نہیں رہا تھا بلکہ خویش پروری، اقربا نوازی اور شاہی کے ٹھاٹ جمانا اس کی غرض و غایت بن گئی تھی۔ لہٰذا اس طرز کی حکومت کو خالص اسلامی حکومت میں تبدیل کرنے کی اگر ہم راہ نہیں پاتے تو کم از کم اس سے کسی قسم کا سروکار بھی رکھنا ہم پسند نہیں کرتے تاکہ تم نہ سہی تمہارے زمانے کے لوگ سہی آئندہ آنے والی نسلیں تو سبق حاصل کر سکیں گی کہ جب خلافت منہاج نبوت اور سلطنت خلافت راشدہ کے طریقے کے بجائے کوئی اور رنگ روپ دھارے تو اس کو اصل شکل دینے کے لیے بہر حال ہاتھ پیر مارنا ضروری ہے اور کچھ نہ سہی تو خاموش عملی احتجاج تو کرنا ہی چاہیے۔

امام احمدؒ نے اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اختیار کیا۔

مگرامام ابوحنیفہؒ ایک مالدار آدمی تھے اور امام احمدؒ ان کے مقابلہ میں یوں کہیے کہ بالکل قلاش تھے یہی وجہ ہے کہ امام احمدؒ کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا امام ابوحنیفہؒ ان سے محفوظ رہے۔ امام احمدؒ نے اس سلسلہ میں ہر مصیبت کو گوارا کیا لیکن اپنی روش نہیں چھوڑی، حتیٰ کہ اپنی اولاد اور اعزہ کو بھی وہ اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ان سے کہتے "تم یہ مال کیوں لیتے ہو جب کہ سرحدیں معطل اور غیر محفوظ ہیں اور "مال فے" مستحق لوگوں میں تقسیم نہیں ہوتا ہے۔

خلوص امام احمدؒ کو اللہ تعالیٰ نے خلوص کی نعمت سے مالا مال کیا تھا۔ للٰہیت گویا آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی! اخلاص نفس کو خود غرضی سے پاک کر دیتا ہے جس سے دل میں نور اور قلب میں بصیرت پیدا ہوتی ہے، ادراک میں جلا اور علوم میں معرفت حاصل ہوتی ہے۔ ہدایت کا نور بھی اسی کو میسر آتا ہے جو مخلص ہو۔ اللہ کے ساتھ مخلص ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام میں اللہ ہی کی خوشنودی پیش نظر ہو، تحصیل علم، ریا اور دکھلاوے کے لیے نہ ہو، مناظرہ بازی اور مجادلہ کے لیے نہ ہو۔ دنیا کا اقتدار حاصل کرنے شہرت اور جاہ طلبی کے لیے نہ ہو۔ امام احمدؒ علم کے اسی مرتبہ پر فائز تھے وہ ذاتی خواہشات سے پاک تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ لوگوں میں ان کا چرچا نہ ہو۔ ریا سے وہ دور بھاگتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے میں چاہتا ہوں کہ کسی گھاٹی میں چھپ کر بیٹھ جاؤں تاکہ کسی کو میرا پتہ نہ چلے اور یہ بھی فرمایا کرتے "وہ شخص کتنا خوش قسمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے گمنام رکھا ہو" یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کے اندر غرور گھمنڈ نام کو بھی نہیں تھا۔ امام یحییٰ ابن معین فرماتے ہیں "میں امام احمدؒ بن حنبل کی پچاس برس تک صحبت میں رہا

اس عرصہ میں انھوں نے اپنی صلاح وخیر میں سے کسی بات کے ساتھ ہم پر فخر و غرور نہیں کیا۔

قوتِ حافظہ امام احمدؒ کو اللہ تعالیٰ نے جن فطری قوتوں اور صلاحیتوں سے خوب خوب نوازا تھا ان میں سے یک قوت حفظ ہے دراصل قوت حفظ ہر قسم کے علوم و فنون کی بنیاد ہے۔ ذہانت اور حاضر جوابی کا جوہر بھی اس کے بغیر نہیں کھلتا۔ اس صفت سے تقریباً تمام ہی محدثینؒ مالا مال تھے لیکن امام احمدؒ اپنے زمانے میں نمایاں اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں میں وکیع سے امام ثوریؒ کی حدیثیں یاد کرتا تھا۔ جب وہ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے گھر جاتے تو میں ان کے ساتھ ہوتا اور گھر تک پہنچتے پہنچتے کبھی تو نو دس حدیثیں یاد کر لیتا اور کبھی اس سے کم جب وہ گھر میں داخل ہو جاتے تو دوسرے طالبان حدیث مجھ سے فرمائش کرتے تھے کہ میں انھیں اپنی یاد کی ہوئی حدیثیں نوٹ کرادوں چنانچہ میں ان کو املا کرا دیتا تھا۔ ابو ذرعہؒ آپ کے ہم عصر تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ مشائخ اور محدثین میں سب سے قوی حافظہ آپ نے کسے پایا جواب دیا احمد بن حنبلؒ کو

صبر واستقامت امام احمدؒ کا یہ وصف ان تمام صفات عالیہ میں نمایاں اور ممتاز تھا جن سے ان کی زندگی مزین تھی۔ مامون، معتصم اور واثق تینوں خلفاء کے عہد میں آپ پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے نت نئے مصائب میں مبتلا کیا گیا۔ ظلم وستم کی چکی چلائی گئی۔ کبھی ہتھکڑیوں، بیڑیوں اور بھاری زنجیروں میں جکڑا گیا اور کبھی نظر بندی اور قیدِ تنہائی کی کیفیت میں مبتلا کیا گیا۔ تازہ دم جلاد ننگی پیٹھ پر درندگی اور حیوانیت کے ساتھ درّے مارتا لیکن آپ اُف نہ کرتے تھے خلوص وللہیت کے بغیر کیا یہ

ممکن تھا؟ اللہ پر بھروسہ اور توکّل کے بغیر یہ صبر و استقامت ہرگز ممکن نہ تھی۔
—— امام صاحب کو دہشت زدہ کرنے کی غرض سے خلیفہ کے دربار میں لایا گیا۔ دو آدمیوں کی گردن آپ کے سامنے اڑائی گئی لیکن اس ہولناک ماحول میں بھی اطمینان کا یہ حال تھا کہ امام شافعیؒ کے ایک شاگرد کو دیکھ کر دریافت کرنے لگے کہ فلاں مسئلہ میں امام شافعیؒ کا کوئی قول آپ کو یاد ہے؟ حاضرین اس اطمینان کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ آپ سے عناد رکھنے والا وزیر، احمد بن ابی داؤد نے تعجب سے کہا اس شخص کو دیکھوا سے یہاں گردن اڑانے کے لیے لایا گیا ہے مگر وہ فقہی مسائل میں دلچسپی لے رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس غیر معمولی قوت کا راز کیا ہے؟ وہ کون سی قوت تھی جس نے امام احمدؒ کو اس قابل بنا دیا تھا کہ مصائب کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کریں اور شدائد پر غلبہ حاصل کریں۔ استاذ ابوذر کہتے ہیں میرے خیال میں تو اس کا راز صرف اتنا ہے کہ اس مردِ جلیل کو صرف خدا پر بھروسہ تھا اور اس کے سوا ان کے دل میں کسی کی عظمت کا خیال تک نہ تھا چونکہ اس وجدانِ عظیم سے ان کا دل بھرپور تھا لہٰذا ہر چیز کو وہ ہیچ خیال کرنے لگے تھے۔ مصائب اور مصائب میں مبتلا کرنے والے دونوں ان کی نگاہ میں ہیچ تھے۔ دنیا کی زینت اور فخر کی چیزیں ان کے نزدیک حقیر تھیں۔ تھوڑے سے سامان زندگی پر قانع تھے لیکن خدا کے لیے عمل کثیر کے بغیر راضی نہیں ہوتے تھے توکل علی اللہ نے انھیں گھٹیا قسم کے اخلاق سے بہت بلند کر دیا تھا۔

تحدیث اور افتاء فتویٰ دینے اور حدیث پڑھانے کی مسند پر آپ چالیس برس کی عمر سے پہلے جلوہ افروز نہیں ہوئے حالانکہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ جیسے بزرگ اس عمر سے پہلے ہی حدیث اور فتویٰ کی

مسند پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ دراصل امام احمدؒ نے اس سلسلہ میں بھی شاید ضروری خیال کیا کہ جس عمر میں عام طور پر پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے نوازا ہے ہیں اس عمر سے پہلے وہ کام کیوں کروں جو دراصل انبیاء اور رسولوں ہی کا کام ہے اور اس مسند پر کیوں بیٹھوں جو پیغمبروں کی مسند ہے۔ اتباع سنت کے اہتمام ہی کا جذبہ تھا جس نے آپ کو اس عمر سے پہلے اس کام سے باز رکھا حالانکہ اس عمر سے کافی پہلے آپ کو علمی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔

درس کی خصوصیات

آپ درس کی دو مجلسیں قائم کرتے تھے۔ ایک اپنے گھر پر جس میں خاص تلامذہ اور آپ کی اولاد شریک ہوتی تھی۔ دوسری مجلس جامع مسجد میں جہاں عام لوگ شریک ہوتے تھے۔ اس مجلس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔

آپ کے درس کی کچھ خوبیاں خصوصی رنگ لیے ہوئے تھیں مثلاً:۔

۱۔ آپ کی مجلس درس میں تواضع، اطمینان، وقار اور سکون کی کیفیت اور فضا رہتی تھی۔ سنجیدگی اور سکینت کی کیفیت، حدیث رسول صلعم کی عظمت اور بلندی کے لیے ضروری بھی تھی۔ یوں بھی جو بات سکون اور وقار کے ساتھ ہو اس کا اثر ہوتا ہے اور جو بات ہنسی اور مزاح کے انداز میں ہو اس کا اثر اول تو ہوتا نہیں اور اگر لطف و لذت کی حد تک کچھ اثر ہوتا بھی ہے تو وہ دیرپا نہیں ہوتا۔ نیز حدیث کا درس عبادت بھی ہے اور عبادت میں ہنسی اور مزاح سے کیا سروکار؟

۲۔ آپ بغیر طلب درس نہیں دیتے تھے۔ جب تک پورا اطمینان نہیں کر لیتے کہ حدیث واقعی حدیث ہے، تب تک اسے حدیث رسول نہیں کہتے تھے یعنی تحقیق

اور تیاری کے بغیر درس نہیں دیتے تھے صرف حافظہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ (حالانکہ آپ قوی الحافظہ تھے) بلکہ پہلے کتاب دیکھ لیتے تھے۔ آپ درس کے دوران غریب طلبہ کی طرف زیادہ توجہ فرماتے تھے چنانچہ ابوبکر مَروزی کی روایت ہے کہ میں نے امام احمدؒ کی مجلس سے بڑھ کر کسی کم مایہ اور غریب طالب علم کو مغرور اور ممتاز نہیں دیکھا۔ آپ ہمیشہ نادار طلبہ کی طرف متوجہ رہتے تھے۔ مخصوص طلبہ کو اور اپنے صاحبزادوں کو بغیر طلب بھی درس دیتے تھے اور املا کراتے تھے۔

۳۔ اپنی رائے اور فتویٰ کو لکھنے سے منع فرماتے تھے حدیث رسول تو آپ املا کراتے تھے اور بیان فرماتے تو لکھنے سے منع نہیں فرماتے تھے لیکن اپنی رائے اور فتویٰ کو لکھنے سے منع فرماتے تھے۔ اصل میں یہ بھی ایک طرح کی عاجزی اور انکساری ہی تھی۔

فقہ حنبلی کی خصوصیات

ہر فقہی مکتب فکر کی کچھ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے وہ الگ مکتب فکر قرار پایا ورنہ اگر اس کی کچھ خصوصیات نہ ہوتیں تو اسے الگ مکتب فکر ہرگز قرار نہ دیا جاتا۔ فقہ حنبلی کی بھی کچھ خصوصیات ہیں مثلاً:۔

۱۔ فقہ حنبلی میں آخر صحابہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے اسی لیے اس کو اثری فقہ بھی کہتے ہیں۔ کسی مسئلہ میں اگر صحابہ کرامؓ سے اختلاف رائے منقول ہوتا ہے تو امام احمدؒ ان میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو اختیار فرما لیتے ہیں اسی لیے ان کے دو قول ہو جاتے ہیں اور اسی کو وقوف عند الاثر کہا جاتا ہے۔ امام احمدؒ اپنے آپ کو اس بات کا حقدار نہیں سمجھتے تھے کہ صحابہ کرامؓ کی مختلف رایوں میں بغیر دلیل شرعی ایک کو دوسری پر ترجیح دیں۔ یہ طریقہ عموماً عبادات میں

اختیار فرما لیتے تھے۔

۲۔ معاملات میں امام احمدؒ کا اصول یہ ہے کہ قرآن و سنّت اور آثار صحابہؓ میں کسی مسئلہ کا حکم اگر نہیں ملتا اور نہ قیاس کی گنجائش نظر آتی ہے تو وہ اباحت اصلیہ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاملات میں یہ فقہ بہت وسیع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی چیز کو صحیح قرار دینے کے لیے دلیل کی ضرورت نہیں۔ جب تک کہ اس کا غلط ہونا ثابت نہ ہو وہ صحیح اور جائز ہے۔

۳۔ اس فقہ کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصالح مرسلہ کا لحاظ کیا گیا ہے یعنی جب کسی مسئلہ میں نص (قرآن یا حدیث کا صریحی بیان) یا اثر (صحابہؓ کا قول یا فعل) نہیں ملتا تو وہ مصلحت عامّہ کا لحاظ کر کے فتویٰ دیتے ہیں کیونکہ شرعی دلائل میں عوام کی مصلحت کا خیال رکھا گیا ہے۔ فقہ مالکی میں بھی مصالح مرسلہ سے کام لیا گیا ہے اور مالکیہ تو اس سلسلہ میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں ــــ امام شافعیؒ نے اسے بالکل نظر انداز کیا ہے بلکہ اسے شریعت میں بے اثر قرار دیا ہے۔ امام احمدؒ نے اعتدال کی راہ اختیار فرمائی ہے۔

۴۔ اس فقہ میں سدِّ ذرائع پر بہت زور دیا گیا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو فقہ حنبلی کو فقہ شافعی سے ممتاز کرتی ہے ورنہ وہ دونوں ایک نظر آتی ہیں۔ حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فقہ حنبلی کو فقہ شافعی سے الگ ایک فقہ تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ فقہ شافعی کی ایک شاخ معلوم ہوتی ہے۔ ابن جریر طبری بھی آپ کو فقیہہ تسلیم نہیں کرتے۔

کارنامے امام احمدؒ کے کارنامے بھی وہی ہیں جو ائمۂ ثلٰثہ کے ہیں مثلاً یہ کہ آپ نے امت کو ایک اسلامی مجموعۂ قوانین دیا۔ ایک فقہی مکتب فکر کی داغ بیل ڈالی کلیات سے جزئیات اخذ کیے فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

اور یہ کام حکومت کی امداد واعانت کے بغیر بلکہ اس کی مخالفت کے باوجود انجام دیا۔ اس کے علاوہ آپ کے کارنامے یہ ہیں۔

۱۔ آپ نے اپنے عملی مگر خاموش احتجاج سے مسلسل حکومت اور عوام پر یہ واضح کیا کہ خلافت معیاری اسلامی حکومت کے بجائے خاندانی اور شخصی بن کر رہ گئی ہے اور اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف ظلم وستم اور استحصال بالجبر کے طریقوں پر عامل ہے۔ نہ تحصیل ووصول میں اسلامی طریقہ کی پابند ہے اور نہ مصارف میں۔

۲۔ آپ نے صبر واستقامت کے اعلیٰ معیار کا نمونہ اپنی زندگی سے پیش کیا کہ حکومت کی غلط روش کے آگے گھٹنے ٹیک دینا اور اس کے ظلم وستم کی وجہ سے حق کو حق نہ کہنا کوئی اچھا اور اعلیٰ کردار نہیں ہے۔ اعلیٰ کردار یہ ہے کہ حکومت کی جابرانہ پالیسی کے خلاف مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے اور سینہ سپر ہو کر اس کے سامنے ڈٹ جانا چاہیے خواہ بدن کی کھال ہی کیوں نہ ادھیڑ ڈالی جائے لیکن ظلم کے مقابلہ میں حق کا اعلان اور اظہار ضروری ہے، خلافت کے غیر اسلامی کردار کا مقابلہ ضروری ہے۔

۳۔ آپ نے نہ صرف شخصی زندگی میں بلکہ معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی میں بھی اتباع سنت کی طرف متوجہ کیا۔

۴۔ فقہ وقانون میں حد سے زیادہ رائے کی دخل اندازی اور قیاس میں غلو پسندی پر بند باندھنے کی کوشش کی اور اصل ماخذوں کی طرف توجہ دینے پر پورا زور صرف کیا۔

وفات

آخر اصلاح وتجدید کا مرد میدان اور فقہ واجتہاد کے میدان کا شہسوار اور صبر واستقامت کا یہ پہاڑ اپنی مہلت عمر پوری کر کے عالم آخرت کو سدھار گیا۔ آپ کی وفات ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ کو بغداد میں ہوئی۔ جمعہ کا دن تھا۔ آپ کے یوم وفات کو بغداد کی تاریخ میں یادگار دن کی حیثیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے آپ کے جنازہ میں آٹھ لاکھ عقیدتمندوں نے شرکت کی اور ہر طبقے کے لوگوں نے رنج والم کا اظہار کیا اور غم منایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

امام غزالیؒ

ایک معلّم، مصلح اور مجدّد

۴۵۰ھ تا ۵۰۵ھ

امام غزالیؒ کی کنیت ابوالحامد نام محمد، والد کا نام بھی محمد ہے خراسان کے ضلع طوس کے علاقہ طاہران میں ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے وطن کے علاوہ جرجان اور نیشاپور میں تعلیم حاصل کی۔ نیشاپور میں اپنے استاذ امام الحرمین کے معید یعنی نائب مقرر ہوئے۔ امام الحرمین فرمایا کرتے ہمارا غزالی تو بحر ذخّار ہے۔ امام الحرمین کے انتقال کے ۴۷۸ھ میں ان کی عمر ۲۸ برس کی تھی لیکن بڑے بڑے علماء سے زیادہ علم وفن اور کمال کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ آپ نے ابتدائی فقہ کی تعلیم استاذ احمد بن محمد رازکانیؒ سے اپنے وطن ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد جرجان میں امام ابوالنصر اسمٰعیلی سے علم حاصل کیا۔ جرجان سے وطن واپس آرہے تھے کہ راہ میں ڈاکوؤں نے قافلہ لوٹ لیا۔ دیگر سامان کے ساتھ امام صاحب کی یادداشتیں بھی ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گئیں جن کا امام صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔
آپ ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور کہا۔ میری تعلیقات (نوٹ بکس) واپس کردیں کیونکہ تمہارے کام کی نہیں ہیں اور میرا تو سرمایہ وہی ہے۔ ڈاکو ہنسنے لگا اور کہا

تم نے آخر سیکھا کیا؟ چند کاغذ تم سے چھن گئے تو کورے رہ گئے۔ اس طنز کا آپ کافی اثر ہوا اور وطن پہنچ کر تعلیقات جوڑا کو نے واپس کر دی تھیں زبانی یاد کرنا شروع کر دیں حتیٰ کہ تین برس میں وہ سارے نوٹس یاد کر لیے جو جرجان میں تیار کیے تھے۔

اس دور میں اگرچہ تمام ممالک اسلامیہ میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں اہل علم موجود تھے اور ہر عالم کا گھر گویا ایک مدرسہ تھا لیکن دو بزرگ ایسے تھے جو استاذ الکل تسلیم کیے جاتے تھے اور ان کا گھر گویا یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک امام الحرمین اور دوسرے امام ابو اسحٰق شیرازی۔

امام غزالیؒ کے زمانہ طالب علمی میں نظامیہ بغداد وجود میں نہیں آیا تھا۔ تاہم نیشاپور میں بڑے بڑے دار العلوم وجود میں آچکے تھے، بیہقیہ، سعدیہ، اور نصریہ جس کو سلطان محمود غزنویؒ کے بھائی نصر بن سبکتگین نے قائم کیا تھا۔ لیکن ان مدارس سے بھی عظیم تر نظامیہ نیشاپور تھا امام الحرمین عبد الملک ضیاء الدین اس میں صدر مدرس اور شیخ الاساتذہ تھے۔ نیشاپور میں آپ نے نظامیہ جیسی تعلیم گاہ اور امام الحرمین جیسے استاذ سے تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے استاذ کے جانشین ہوئے۔

پھر جب نظام الملک طوسی نے نظامیہ بغداد قائم کیا تو اس نے بہت جلد دنیا کی عظیم ترین یونیورسٹی کا مقام حاصل کیا۔ اس کی صدارت کے لیے نظام الملک نے آپ کو چنا۔ نظامیہ کی صدارت کسی بھی عالم کے لیے سب سے بڑا اعزاز تھا اس وقت آپ کی عمر ۳۴ سال تھی۔ آپ ۴۸۴ھ میں بڑی شان سے بغداد میں داخل ہوئے اور صدارت کے منصب پر فائز ہوئے۔

زمانہ آپ کی ذہانت اور علمی مہارت کا اور عالی دماغی کا قائل ہو گیا۔

عباسی خلیفہ معتدی باللہ نے آپ کو اپنا سفیر بھی بنایا، خلیفہ مستظہر باللہ کو آپ سے خاصی عقیدت تھی۔ باطنیہ کے رد میں اپنی تصنیف کا نام مستظہری خلیفہ ہی کے نام پر رکھا۔

تزکیہ نفس کی فکر

کسی اہل علم کو جس قدر عروج و اقتدار اور عزت و فضیلت حاصل ہو سکتی تھی وہ آپ کو حاصل تھی، دوسرا کوئی ہوتا تو ہر طرح کوشش کرتا کہ یہ عروج و عزت زندگی بھر اسے حاصل رہے لیکن امام صاحب چونکہ بے چین طبیعت اور بلند ہمت کے مالک تھے اس لیے آپ نے دنیاوی بلندی اور عروج کو راہ کا روڑا خیال کیا اور اسے چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

آپ نے کتاب و سنّت کا علم حاصل کیا تھا فلسفہ پڑھا تھا بلکہ اس میں تالیف و تصنیف کی بھی صلاحیت اور مہارت رکھتے تھے۔ آپ کے علم کلام کے بھی شہسوار تھے۔ باطنیت کو بھی آپ نے خوب کھنگالا تھا حتیٰ کہ اس کے رد میں تالیف و تصنیف کے مرحلوں سے بھی گزر چکے تھے، تصوف میں بھی ابو طالب مکی کی قوت القلوب، حارث محاسبیؒ کی کتابیں، حضرت جنید بغدادیؒ، شبلیؒ اور بایزید بسطامیؒ کے ملفوظات وغیرہ کا بھی مطالعہ کر چکے تھے لیکن آپ اپنے تزکیہ کی طرف سے پھر بھی مطمئن نہیں تھے چنانچہ وہ بغداد سے نکل کھڑے ہوئے۔ شام پہنچے، دمشق میں دو سال رہے پھر بیت المقدس گئے، اور پھر وہاں سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور ہر جگہ تزکیہ نفس کی فکر میں ریاضت اور مجاہدے میں مصروف رہے اس طرح مختلف مقامات کی خاک چھانتے رہے خلوت میں دس برس گزرا کہ جب آپ کو سکون نصیب ہوا تو اہل و عیال یاد آئے۔ چنانچہ آپ نے ۴۹۹ھ میں پھر بغداد کو آباد کیا اور مدرسہ نظامیہ کو زینت بخشی۔ لیکن اب آپ کی ذہنیت، رجحان طبع اور غرض و نیت میں زمین و آسمان کا فرق

تھا۔ پہلے سب کچھ (جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے) دنیا کے لیے تھا اور اب زندگی دین و آخرت کے لیے وقف تھی۔

حالاتِ زمانہ وہ حالات، پس منظر اور بگاڑ کے اسباب کیا تھے جن میں آپ نے آنکھیں کھولیں؟ جائزہ لیا اور تجدید و اصلاح کا بیڑا اٹھایا جب تک اس پس منظر اور بگاڑ کا اندازہ نہ ہو کسی بھی مجدد کے کارناموں کا صحیح اندازہ کرنا اور ان کی اہمیت محسوس کرنا آسان نہیں ہے۔

• امام ابوالحسن اشعریؒ اور امام ابومنصور ماتریدیؒ کے مکاتبِ فکر، اجتہاد اور استدلال کی قوتوں سے کام لینے کے بجائے علم کلام میں بھی نقل در نقل اور تقلید کی طرف مائل تھے حالانکہ عقل و فکر اور انسان کا ذہن ہمیشہ ترقی پذیر ہے نیز یہ لوگ فلسفہ یونان کی اصطلاحات بھی زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی طرف مائل تھے۔

• معتزلہ کا زور اگرچہ ٹوٹ چکا تھا لیکن چونکہ وہ اصلاً دینی ذہن کے لوگ تھے وحی و نبوت اور تمام منصوص عقائد کے قائل تھے اور عقلی استدلال سے دین اور خصوصاً دینی عقائد کا اثبات اور ان کی مدافعت ہی ان کا مشغلہ اور نصب العین تھا! ان کی اگر کوئی غلطی تھی تو وہ یہ تھی کہ انھوں نے ان عقائد اور حقائق کو جو مخالفِ عقل تو نہیں البتہ عقل کے ماورا ضرور ہیں ان کو بھی عقل کے ذریعہ ثابت کرنا ضروری سمجھا! اسی لیے انھوں نے ٹھوکریں کھائیں، ان کی دوسری غلطی یہ تھی کہ اقتدار حاصل ہو جانے پر انھوں نے علمی اور عقلی مسائل کو علم و عقل کے ذریعہ سمجھانے اور طے کرنے کے بجائے آزادی رائے کے علمبردار ہوتے ہوئے تشدد اور جبر بلکہ ظلم اور بربریت سے کام لیا۔ بہرحال ان کے انحطاط سے ایک بڑا نقصان ہوا اور وہ یہ کہ جو لوگ عقل و فکر اور ذہن و دماغ سے کام لینا چاہتے تھے

جب انھوں نے اس سلسلہ میں دین کا دروازہ بند پایا تو وہ خالص یونانی فلسفہ کی طرف متوجہ ہو گئے، جو وحی و نبوت کا منکر اور دین کا مخالف ہے۔

• یونانی فلسفہ کے فروغ سے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو کھلم کھلا دین کی اہانت کرتا اور اعلانیہ بلکہ فخریہ طور پر دین سے بے تعلقی کا اظہار کرتا تھا کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ ظاہر میں مسلمان اور باطن میں ان کو دین سے کوئی لگاؤ نہیں تھا لیکن اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے اپنی بے دینی کا اعلان و اظہار نہیں کرتے تھے۔[1]

• فلسفہ کے اثر سے ایک اور فتنہ "باطنیت" پیدا ہوا۔ اس فتنہ کو اغوا شدہ، حب دنیا اور خواہشات نفس نے خوب خوب فروغ دیا اور پروان چڑھایا۔ باطنیت کی شکل میں بے دینوں کو ایک کامیاب حربہ ہاتھ لگا تھا کہ قرآن و حدیث اور دین و شریعت کی مخصوص اصطلاحات مثلاً صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج، فرض، واجب اور حلال و حرام وغیرہ کے الفاظ جوں کے جوں باقی رکھے جائیں مگر ان کی روح نکال لی جائے اور خود ساختہ معنی و مفہوم ان کے اندر داخل کر کے ان کی خوب خوب اشاعت کی جائے۔ اس طرح دین کو جلد اور آسانی سے ڈائنامیٹ کیا جا سکے گا۔

باطنیت دراصل سیاسی تحریک تھی جس کے لیے ایک فلسفہ اور مذہب گڑھا گیا تھا اس کے علمبردار عموماً ان قوموں کے افراد تھے جو اسلام کے مقابلہ میں اپنا اقتدار کھو چکی تھیں۔ شہرت پرست اور اقتدار کے بھوکے لوگ باطنیت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے، اور ایک طویل عرصے کے لیے اسلام اور مسلمانوں اور اقتدار

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت اول ص۱۰۵

سب کے لیے بلائے بے درماں بنے رہے۔ باطنیہ کی چند اصطلاحیں سامنے آجائیں توان کی بے دینی کا اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ نبی :۔ اس ذات کا نام ہے جس پر قوت قدسیہ صافیہ کا فیضان ہو۔

۲۔ جبریل :۔ کسی ہستی کا نام نہیں بلکہ صرف فیضان کا نام ہے۔

۳۔ معاد (آخرت) ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف واپس آنا۔

۴۔ جنابت :۔ افشائے راز (باطنیوں کا راز)

۵۔ غسل :۔ تجدید عہد۔ (باطنیت کا عہد)

۶۔ زنا :۔ علم باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا جو عہد باطنیت میں شریک نہ ہو وغیرہ ذالک من الخرافات[1]

بہر حال یہ حالات تھے جن میں امام غزالیؒ جیسا امام وقت پیدا ہوا اور اس نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

کارنامے امام غزالیؒ ایک معلم ایک مصلح اور ایک مجدّد کے مقام پر فائز تھے آپ کی زندگی علمی، اصلاحی اور تجدیدی کارناموں سے پُر ہے مثلاً :۔

۱۔ آپ نے فلسفہ اور باطنیت کے مقابلہ میں اسلام کی طرف سے بھرپور مدافعت کی اور ہر اس اعتراض اور وسوسہ کا مدلل جواب دیا جو فلسفہ اور باطنیت کے علمبردار اسلام پر کرتے تھے۔

۲۔ آپ نے صرف مدافعت نہیں کی بلکہ باطنیت اور فلسفہ کی بنیاد پر اس زور استدلال کے ساتھ حملہ کیا کہ باطل کی چولیں ڈھیلی پڑ گئیں اور اس کی

---

[1] کتاب مذکور ص ۱۰۹

جڑیں کھوکھلی ہو گئیں۔

۳- آپ نے زندگی کے ہر پہلو کا گہرا مطالعہ کیا اور دقّت نظر سے جائزہ لے کر ہر ایک کی علمی و فکری طور پر اصلاح کا بیڑا اٹھایا جس کا ثبوت احیاء العلوم آج بھی موجود ہے۔

۴- معاشرت اور اخلاق اور زندگی کے دوسرے رخوں میں جو اسلام اور غیر اسلام گڈمڈ ہو گئے تھے، ہر ایک کا آپریشن کر کے سڑے ہوئے حصوں کو کاٹ پھینکا اور اصلاح پذیر حصّوں کی مرہم پٹی کر کے نئی زندگی کی راہ پر گامزن کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

۵- آپ نے مقاصد الفلاسفہ لکھ کر ثابت کیا کہ علوم عقلیہ میں سے ریاضیات سے اسلام کا کوئی ٹکراؤ نہیں۔ ریاضی کے اصول اٹل ہیں منطق میں اگرچہ غلطیاں ہیں مگر اسلام سے اس کا کوئی خاص تصادم نہیں ہے۔ البتہ الٰہیاتی فلسفہ سے اسلام کا تصادم ہے لہٰذا تہافتہ الفلاسفہ لکھ کر آپ نے الٰہیاتی طبیعاتی فلسفہ کی ایک ایک کمزوری کو دو ٹوک الفاظ میں بڑی جرأت اور قوۃ کے ساتھ بیان کیا[1]۔ اور بقول صاحب "تجدید و احیاء دین" امام غزالیؒ کے کارنامے یہ ہیں۔

• "آپ نے یونانی فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا، اس میں مہارت پیدا کی اور اس پر ایسی تنقید کی کہ مسلمانوں پر جو اس کا رعب چھا گیا تھا جاتا رہا یا کم ہو گیا اور جو لوگ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو اس پر منطبق کرنے کے سوا دین کے بچاؤ کی کوئی راہ نہ پاتے تھے وہ بڑی حد تک آگاہ ہو گئے۔ امام غزالیؒ کے اس کارنامہ کا

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت اوّل

اثر صرف مسلم ممالک ہی تک محدود نہ رہا بلکہ یورپ تک پہنچا اور وہاں بھی اس نے فلسفہ یونان کے تسلط کو ہٹانے اور تنقید و تحقیق کے جدید دور کا دروازہ کھولنے میں حصّہ لیا۔

• آپ نے ان مسلم علماء کی اصلاح کی جو خواہ مخواہ علوم عقلیہ اور دینی عقائد میں تضاد محسوس کر کے ہر اس بات کا انکار کرتے تھے جو بظاہر دین سے ٹکراتی ہوئی نظر آتی تھی۔ امام غزالیؒ نے ثابت کیا کہ تمہارے خود ساختہ اصولِ موضوعہ عقلی براہین، تجربات اور مشاہدات کا ٹکراؤ دین کے لیے ہرگز خطرہ نہیں ہے۔ دینی تعلیم خود ٹھوس معقول بنیادوں پر قائم ہے۔

• آپ نے اسلام کے عقائد اور اساسی تعلیمات (Fundamentals) کی ایسی معقول اور عقلیات کے مطابق تعبیر پیش کی کہ کئی صدیوں تک معقولات کی بنا پر ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔

• آپ نے احکام شریعت کے اسرار، مصلحتیں اور حکمتیں موجودہ ذہنی ترقی کے پیش نظر بیان کیں اور دین کا ایسا نکھرا ہوا تصور سامنے رکھا جس سے لوگوں کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ اسلام عقلی امتحان کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتا۔

• آپ نے مذہبی فرقوں اور ان کے اختلافات کا اچھی طرح جائزہ لے کر فساد کی بنیادیں اور تفرقہ کے اسباب معلوم کیے اور ان کا علاج تجویز کیا۔ آپ نے اچھی طرح واضح کیا، اسلام اور کفر کی امتیازی سرحدیں کیا ہیں؟ وہ حدود کیا ہیں جن کے اندر رہ کر رائے اور تاویل کی آزادی ہے اور جن سے تجاوز کرنا کفر کے ہم معنی ہے؟ اسلام کے واقعی عقائد کیا ہیں؟ اور کن چیزوں کو خواہ مخواہ دینی عقائد میں شامل کر لیا گیا ہے؟

اس طرح امام غزالیؒ کی کوششوں سے تکفیر بازی کے مشاغل بے جان ہوگئے اور تفرقہ بازی ماند پڑ گئی۔

• آپ نے دینی شعور بیدار کیا، اندھی تقلید کی سخت مخالفت کی، کتاب و سنّت سے ملّت کو وابستہ کیا، ہر گروہ اور ہر طبقے کی گمراہیوں پر تنقید کر کے اسے جھنجھوڑ دیا اور اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔

• آپ نے نظام تعلیم مرتب کیا جس میں آپ نے "علوم دین" اور "علومِ دنیا" کی تفریق مٹا کر دینی و دنیوی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یکساں نظام بنایا اور جو علوم اہمیت نہیں رکھتے تھے مگر انھیں یہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی انھیں چھانٹ دیا۔ حتیٰ کہ تمام مسلم ممالک میں آپ ہی کے تجویز کردہ خطوط پر تعلیمی نظام جاری کیے گئے۔

• آپ نے علماء، مشائخ، امراء، سلاطین اور عوام سب کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کے اخلاق کا اچھی طرح جائزہ لیا اور ہر ایک کی اخلاقی حالت پر تنقید کی اور ایک ایک برائی پر انگلی رکھی اور ہر برائی کے اسباب کا کھوج لگایا اور اسلام کے صحیح اخلاقی معیار پر سب کو جانچا پرکھا اور اسی طرف لانے کی کوشش کی۔

• آپ نے اپنے عہد کے نظام حکومت پر بھی سخت تنقید کی اور ایک ایک مرض کی تشخیص کر کے اس کا علاج تجویز کیا اور عوام میں آزادی کا صور پھونکا۔

• آپ کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے زبانی اور تحریری طور پر دو ٹوک الفاظ میں نظام حکومت تبدیل کرنے اور صحیح حکومت قائم کرنے کی دعوت دی۔[1]

• امام غزالیؒ کے تصنیفی کارنامے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا

---

[1] تجدید و احیاء دین ص ١٩ تا ٤٧

شبلیؒ نے الغزالی میں امام غزالیؒ کی ۷۸ تصنیفات کی فہرست نقل کی ہے جن میں سے چند متعدد جلدوں میں ہیں اور ایک یاقوت التاویل تو چالیس جلدوں میں ہے[۱] اور یہ تصنیفات کسی ایک علم وفن سے تعلق نہیں رکھتی ہیں بلکہ اصول فقہ، فقہ، منطق، فلسفہ، کلام، تصوف، رجال، مواعظ وغیرہ مختلف علوم وفنون میں آپ کی تصانیف ہیں۔ آپ کی تصنیفات اسلامی ممالک ہی میں نہیں بلکہ یورپ میں بھی مقبول ہوئیں اور صدیوں تک ان کا چرچا رہا۔ یہ ہیں وہ کارنامے جن کی وجہ سے امام غزالیؒ ایک معلّم، مصلح، اور مجدّد کہلانے کے مستحق ہیں اور امام کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

۱۔ الغزالی ص ۲۴

شیخ عبدالقادر جیلانی رح

ایک عظیم مُصلح

۴۷۱ھ تا ۵۶۲ھ

شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے دور سے لے کر آج تک جس قدر اہل علم اور فضل و کمال والے گزرے ہیں سب آپ کے علم و تقویٰ کے معترف ہیں۔ کون ہے جو آپ کی بزرگی کا قائل نہ ہو، کون ہے جس کے دل میں آپ کی عظمت نہ ہو؟ بڑی احسان فراموشی ہوگی اگر آپ کی خدمات کو سراہا نہ جائے۔ آپ اسلامی زندگی کے لیے ایک عظیم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صرف اہل تصوف نہیں بلکہ اہل فقہ، اہل کلام اور اہل حدیث نے بھی آپ کو امام تسلیم کیا ہے۔

نام و نسب اور تعلیم آپ کا نام عبدالقادر اور کنیت ابو محمد ہے۔ آپ کے والد کا نام سید موسیٰ اور کنیت ابو صالح ہے۔ دادا کا نام سید ابو عبداللہ یحییٰ ہے۔ آپ اپنے والد کی طرف سے حَسنی اور ماں کی جانب سے حُسینی سید ہیں۔ آپ گیلان میں ۴۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ انتہائی متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ موصوفہ کا نام فاطمہ کنیت ام الخیر اور لقب امۃ الجبّار تھا۔ آپ حضرت عبداللہ الصّومعی کی بیٹی اور سراپا خیر و برکت تھیں۔ آپ جیلان کے مشائخ اور رؤسا میں سے تھے۔ نہایت پرہیزگار اور صاحب

فضل و کمال بزرگ تھے۔

آپ کی والدہ نے اپنے بچے کی تربیت کچھ اس طرح کی کہ وہ بچپن ہی سے تقویٰ اور پرہیزگاری سے مزین ہو گیا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بچپن ہی کا واقعہ ہے کہ آپ تحصیل علم اور طلب علم کی غرض سے اپنی والدہ کے اشارہ اور اجازت سے ایک قافلہ کے ساتھ گیلان سے بغداد کے لیے روانہ ہوئے۔ والدہ نے آپ کے کوٹ کے استر میں چند اشرفیاں سی دی تھیں اور نصیحت کی تھی کہ بیٹا جھوٹ نہ بولنا۔ راہ میں ڈاکوؤں نے قافلہ لوٹ لیا اور جب کسی ڈاکو نے آپ سے پوچھا۔ صاحبزادے! تمہارے پاس کیا ہے؟ تو آپ نے صاف بتا دیا میرے پاس اشرفیاں ہیں۔ ڈاکو نے پوچھا کہاں ہیں؟ آپ نے فرمایا میرے کوٹ کے استر میں سلی ہوئی ہیں۔ ڈاکو حیران رہ گیا، کہ لڑکے نے اس قدر سچائی سے کام کیوں لیا؟ اس نے پوچھا، میاں صاحبزادے اگر نہ بتاتے تو تمہاری اشرفیاں ہماری نظر سے اوجھل رہتیں اور بچ جاتیں۔ آخر اس قدر سچّائی کی کیا ضرورت تھی؟ آپ نے فوراً کہا میری ماں نے نصیحت کی تھی، بیٹا کبھی جھوٹ نہ بولنا۔ ڈاکو آپ کو اپنے سردار کے پاس لے گیا۔ سردار آپ کے اس کردار سے اس قدر متاثر ہوا کہ لوٹا ہوا سارا مال و اسباب واپس کر دیا کہ یہ لڑکا اپنی ماں کا جب اس قدر فرماں بردار اور اپنے عہد کا اس قدر پکا ہے تو میں کیوں اپنے مالک حقیقی سے بے وفائی کرتا رہوں، اس کی نافرمانی میں اپنی زندگی کو کیوں لت پت رکھوں۔ وہ تائب ہو گیا اور آئندہ شریفانہ زندگی گذارنے کا عہد کر لیا۔ اس واقعہ سے شیخ کا نہ صرف تقویٰ اور پرہیزگاری معلوم ہوتی ہے، نہ صرف تحصیل علم کا شوق ظاہر ہوتا ہے، نہ صرف والدہ کی اطاعت اور پابندیٔ عہد کی خوبیاں سامنے آتی ہیں بلکہ آپ کی والدہ کی تربیت کا اثر اور علم کی

اہمیت جو اس محترم خاتون کے دل میں تھی وہ بھی کھل کر سامنے آتی ہے۔

بہر حال قافلہ ڈاکوؤں کی مصیبت سے نجات پاکر خوشی خوشی روانہ ہوا اور بغداد پہنچا۔ آپ نے بغداد کے مشہور مدرسہ نظامیہ میں داخلہ لیا اور ایک عرصہ تک تحصیل علم میں مشغول اور منہمک رہے۔ کم وبیش تیرہ[۱۳] علوم میں مہارت پیدا کی۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور سب ہی اسلامی علوم میں ملکہ پیدا کرلیا۔ یہاں تک کہ اجتہاد کی قابلیت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ آپ پہلے شافعی فقہ پر عمل کرتے تھے۔ بعد میں اپنی تحقیق سے حنبلی مسلک اختیار فرمایا تھا اور امام احمد بن حنبلؒ کے اصول پر قرآن وحدیث سے مسائل اخذ فرماتے تھے۔

کسی نے دریافت کیا آپ نے خدا سے کیا حاصل کیا تو فرمایا "علم وادب"

آپ نے تحصیل علم کے لیے بڑے بڑے مصائب جھیلے ہیں اور بڑے صبر اور استقامت کا ثبوت دیا ہے۔ خود بیان فرماتے ہیں۔ جب سختیاں مجھ پر زیادہ گذرنے لگتیں، تو میں زمین پر لیٹ جاتا اور فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا پڑھنے لگتا۔ پھر زمین سے سر اٹھاتا تو کلفتیں دور ہو جاتیں۔ میں سبق پڑھ کر جنگل کی طرف نکل جاتا۔ دن رات جنگل بیابان میں رہتا۔ صوف کا جبہ پہنتا اور ایک چھوٹا سا عمامہ باندھتا اور ننگے پیر ہر جگہ پھرتا۔ کاہو کا ساگ اور دیگر نباتات کی کونپلیں اور جنگلی خرنوب کھایا کرتا اور اس طرح میں نے طالب علمی کے دن گذارے اور علم دین حاصل کیا۔[۱]

کارنامے آپ نے درس وتدریس اور وعظ وارشاد تینوں طریقوں سے کام لیا۔ اپنے ایک استاذ قاضی ابوسعید مخرمیؒ کے مدرسہ کو زینت

---

[۱] قلائد الجواہر۔

بخشی۔ بہت جلد طلبہ کی کثرت سے مدرسہ کی عمارت تنگ محسوس ہونے لگی۔ آپ کے وعظ میں بے شمار لوگ شریک ہوتے تھے۔ اثر پذیری اور اثر انگیزی کا یہ حال تھا کہ ایک ایک مجلس میں ہزاروں بے عمل اور بدعمل اپنے فسق و فجور سے اور سیکڑوں یہودی اور عیسائی اپنے کفر و شرک سے توبہ کر لیتے تھے۔

۲۔ آپ نے وعظ و تقریر کے علاوہ تحریر سے بھی کام لیا۔ تصنیف اور تالیف کو بھی اصلاح کا ذریعہ بنایا، تنقید اور تبصرہ سے بھی کام لیا۔

۳۔ آپ نے صرف مسلمانوں کی اصلاح کی کوششوں پر بس نہیں کیا بلکہ غیر مسلموں میں دین کی دعوت دینے اور حق کی اشاعت کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ چنانچہ شیخ کا اپنا بیان ہے کہ میری تمنا ہوتی ہے کہ صحراؤں میں رہوں، نہ کوئی مجھے دیکھے نہ میں کسی کو دیکھوں، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی اصلاح کا کام مجھ سے لینا ہے۔ میرے ذریعہ سے پانچ ہزار یہودی اور عیسائی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اور ایک لاکھ سے زیادہ غلط کار اور جرائم پیشہ لوگ توبہ کر چکے ہیں۔[1]

۴۔ روزانہ تفسیر، حدیث، فقہ، اختلاف مذاہب، اصول فقہ اور نحو کے اسباق پڑھاتے، تجوید کی تعلیم بھی دیتے، فتویٰ نویسی کا فریضہ بھی انجام دیتے۔ اس طرح ہزاروں لاکھوں انسانوں نے آپ سے فیض پایا۔

۵۔ حکومت کی اصلاح اور ظالموں پر تنقید سے کسی بھی دور کے علمائے حق غافل نہیں رہے۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ جیسا شیخِ وقت اس فریضہ سے کیسے غافل رہ سکتا تھا چنانچہ آپ کے بارے میں ابن کثیرؒ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ آپ خلفاء، وزراء، سلاطین، قضاۃ، خواص اور عوام سب کو معروف کا حکم دیتے

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت اوّل ص ۱۸۶۔

اور منکرات سے منع فرماتے اور بڑی صفائی اور جرأت سے ان کو بھرے مجمع میں اور برسر ممبر ٹوک دیتے تھے۔ جو کسی ظالم کو حاکم بناتا اس پر اعتراض کرتے اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی قطعاً پروا نہ کرتے[1]

۶۔ خلق کی اصلاح کا بیڑا جو آپ نے اٹھایا تھا اسے اگرچہ تصوف ہی کے ذریعہ پار لگانے کی آپ نے کوشش فرمائی، پھر بھی تصوف کی اصلاح کی طرف سے بھی آپ غافل نہیں رہے چنانچہ مولانا علی میاں لکھتے ہیں۔ تصوف کو بدعات سے پاک کرنے اور کتاب وسنت کو اس کا ماخذ بنانے کی کوشش میں حضرت شیخؒ کا تجدیدی حصہ ہے[2]

اقوال زرّیں کسی شخصیت کے مقولے اس کی شخصیت کے غمّاز ہوتے ہیں۔ کسی باعظمت انسان کے اقوال نہ صرف اس کا ذہن ومزاج نہ صرف اس کا فکر وخیال اور نہ صرف اس کے کردار کی بلندی ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں بلکہ اس کے اقوال کے ذریعہ اس کا پیغام بھی نکھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ شیخ جیلانیؒ کی شخصیت کو ہم ان کے اقوال سے اچھی طرح پرکھ سکتے ہیں۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرو اور بدعتوں سے دور رہو۔

۲۔ اللہ اور رسول کی اطاعت کے دائرہ سے الگ راہ اختیار نہ کرو۔

۳۔ ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہوں سے زندگی کو پاک رکھو۔

۴۔ اپنے حقیقی مالک کے آستانہ پر پڑے رہو۔

---

[1] کتاب مذکور ص ۱۹۵ [2] کتاب مذکور ص ۲۰۶

۵۔ صبر اور ثابت قدمی اختیار کرو اور بے صبری سے اپنا دامن بچائے رکھو۔

۶۔ تفرقہ سے بچو اور رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہو۔

۷۔ یادِ خدا اور ذکر الٰہی کی بنیاد پر اکٹھا ہو جاؤ۔

۸۔ دل کے دروازہ پر دربان بن کر بیٹھ جاؤ۔ ہویٰ و ہوس اور خواہشات کو اندر نہ جانے دو یہ چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں۔

۹۔ جس شخص کے اعمال و اخلاق کتاب و سنّت کی کسوٹی پر پورے اتریں اس سے محبت کرو۔

۱۰۔ مصیبت میں آدمی بے صبری کا شکار ہو جائے اور مخلوق کے سامنے شکوہ شکایت کرنے لگے تو سمجھو یہ مصیبت اس کے لیے عذاب ہے اور اگر صبر کرے، شکوہ شکایت نہ کرے تو سمجھو مصیبت اس کے لیے گناہوں کا کفّارہ ہے۔

۱۱۔ جہاں تک ہو سکے قسم نہ کھاؤ — اس سے قلب پر انوار الٰہی کا دروازہ کھلے گا رفعت حاصل ہوگی۔ عزم و ارادہ میں قوۃ اور استحکام پیدا ہوگا

۱۲۔ جھوٹ سے بچو ہنسی مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولو — اس سے شرحِ صدر حاصل ہوگی اور علم صافی نصیب ہوگا۔

۱۳۔ ایفائے عہد سے سخاوت اور حیا کے مرتبے آشکارا ہوتے ہیں۔

۱۴۔ مخلوق خدا پر لعنت نہ بھیجو، خدا تمہاری آبرو محفوظ رکھے گا۔

۱۵۔ کسی کے لیے بددعا نہ کرو اور جور و ستم برداشت کرو۔ اس طرح عام لوگوں کی محبت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوگی۔

۱۶۔ اپنی روزی کا بار کسی پر نہ ڈالو۔ اس طرح بھلائیاں پھیلانے اور برائیاں مٹانے کا فریضہ اچھی طرح انجام دے سکو گے اس میں عزت بھی ہے اور اسی سے یقین و توکل کی صفات بھی پروان چڑھتی ہیں۔

۱۷۔ ابن آدم سے طمع نہ رکھو کہ عزت، غنی یقین، توکل اور زہد و ورع کا حصول اسی پر منحصر ہے۔

۱۸۔ مرتبہ کی بلندی، تقویٰ میں کمال اور صالحین کی منزلیں حاصل کرنا چاہتے ہو تو تواضع اور مدارات کو عادت بنالو۔

۱۹۔ تقویٰ کو لازم پکڑ لو، ماسوا سے بیم و رجا نہ رکھو، تمام حاجتیں خدا کے سپرد کر دو۔ اسی سے مانگو، غیر اللہ پر بھروسہ نہ کرو۔

۲۰۔ پہلے اپنے ساتھ شریعت الٰہی کا چراغ لے لو پھر عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاؤ۔

وفات حیات اور موت کا خالق تو حیّ و قیّوم ہے صرف وہی ایسا ہے جو ہمیشہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کے علاوہ ہر ایک پر موت طاری ہونے والی ہے ہر ایک کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت۔ چنانچہ درس و تدریس، وعظ و ارشاد اور تالیف و تصنیف کے ذریعہ مسلمانوں کی اصلاح میں زندگی کھپانے اور غیر مسلموں میں اشاعت دین میں زندگی گھلانے کے بعد شیخ ۵۶۲ھ میں موت کی آغوش میں سونے پر مجبور ہوئے۔ مرض الموت اور نزع کے عالم میں بھی آپ کی زبان پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ جاری رہا۔ توحید توحید کی صدا لگاتے ہوئے اپنے مالک کے حضور پہنچ گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آپ نے متعدد تصانیف چھوڑی ہیں۔ غنیۃ الطالبین اور فتوح الغیب زیادہ مشہور ہیں۔ قاضی سلمان منصور پوری رح لکھتے ہیں جس شخص نے فتوح الغیب کو غور و تدبر سے نہیں پڑھا وہ حضرت سے بالکل ناآشنا ہے۔ اس کتاب میں علم و حکمت اور اسرار و معرفت کے لطائف عالیہ درج ہیں۔ اسی کتاب سے یونانی تصوف، ایرانی تصوف اور ہندوستانی تصوف سے

اسلامی تصوف کا فرق معلوم ہوتا ہے۔[1]

اخلاق و عادات

آپ کی عمر اگرچہ درس و تدریس اور وعظ و ارشاد میں گذری اس کے باوجود آپ کم گو اور قلیل گفتار تھے۔ جب کبھی وقت فارغ ہوتا تو خاموش رہتے لیکن آپ کی خاموشی بھی سوچ بچار اور غور و فکر کی خاموشی ہوتی تھی۔ خدا کی صفات، دنیا کی بے ثباتی، اپنی ذمہ داریاں، امت کی اصلاح، اسلام کی اشاعت وغیرہ کے متعلق تدبر اور سوچ بچار کرتے رہتے۔ گویا ہر وقت آپ ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے۔ آپ حق بات ممبر پر کھڑے ہو کر بھرے مجمع میں کہدیا کرتے تھے۔ خلیفہ وقت کو بھی برملا ٹوک دیا کرتے تھے۔ خلیفہ مقتفی نے یحیٰی ابن سعید کو جو ظالم تھا قاضی بنا دیا۔ آپ نے ممبر پر کھڑے ہو کر خلیفہ سے کہا آپ نے ایک بڑے ظالم کو منصب قضا پر مامور کر دیا ہے۔ کل خدا کو کیا جواب دیں گے؟ خلیفہ پر آپ کے ٹوکنے کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ کانپ اٹھا اور رونے لگا اور یحیٰی ابن سعید کو معزول کر دیا۔ آپ طلبہ پر بڑے شفیق اور مہربان تھے۔ مہمان نوازی میں بھی آپ بہت آگے تھے۔ مہمانوں کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ اپنے صاحبزادوں کو ان کی خدمت پر مامور فرمادیتے تھے۔ غریب طلبائ کے کھانے پینے کا انتظام فرماتے تھے۔ آپ نہایت رقیق القلب، علم دوست، خلیق اور سخی تھے۔ خدا کی عبادت میں نہایت محنت اور مشقت برداشت کرتے تھے۔ مستقل مزاجی اور استقامت کی صفت بھی آپ میں نمایاں تھی۔ آپ علمار کا لباس زیب تن فرماتے، انتہائی وقار کے ساتھ تخت پر بیٹھ کر وعظ فرماتے۔ آپ کی شخصیت اور کلام میں اس قدر کشش اور تاثیر تھی کہ لوگ

---

[1] تاریخ المشاہیر ص ۸۴

آپ کی بات بڑے غور سے سنتے اور متاثر ہوتے تھے۔ آپ نیک باتیں بتاتے بھلائی کا حکم کرتے، برائی کی باتوں سے منع فرماتے، منکرات سے باز رکھتے۔ اس کے علاوہ اِدھر اُدھر کی باتیں بالکل نہ فرماتے۔ روزانہ شام کو آپ کا دستر خوان بچھایا جاتا۔ آپ اپنے مہمانوں کے ہمراہ کھانا کھاتے۔ غرباء اور مساکین کے ساتھ آپ زیادہ بیٹھا کرتے۔ طالب علم ہمیشہ آپ کے پاس بکثرت موجود رہتے۔ آپ کی مجلس میں ہر شخص یہ خیال کرتا کہ شیخ کی نگاہ میں میری عزت ہے۔ جو لوگ آپ کی مجلس میں آتے اور پھر کسی وجہ سے فیض صحبت سے محروم ہو جاتے آپ ان کا حال دریافت کرتے اور ان کی خیریت معلوم کرتے رہتے، انھیں یاد رکھتے، انھیں بھول نہ جاتے۔ کسی سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا تو آپ اسے معاف فرما دیتے۔ اکل حلال کا اس قدر اہتمام فرماتے کہ آپ کے واسطے آپ ہی کے پیسے سے غلّہ الگ بویا جاتا۔ آپ تحفے تحائف بھی قبول فرما لیتے لیکن تحفہ کے بدلے میں تحفہ ضرور دیتے۔ فرماتے کھانا کھلانے اور حسن و اخلاق سے پیش آنے سے افضل کوئی عمل نہیں ہے۔ اگر میرے ہاتھ میں دنیا ہوتی تو میں یہی کام کرتا کہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا رہتا۔

ایک بار آپ نے فرمایا: میرے پاس پیسہ رکتا نہیں ہے۔ اگر صبح کو ہزار دینار ہوتے ہیں تو شام تک ایک بھی نہیں بچتا ہے سب خدا کے بندوں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے[1]

---

[1] قلائد الجواہر۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

ایک عظیم مجاہد

سلطان ایوبی فاتح بیت المقدس کا نام صلاح الدین یوسف، والد کا نام نجم الدین اور دادا کا نام ایوب بن شاذی ہے۔ دادا ہی کی طرف ایوبیؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۵۳۲ھ میں دریائے دجلہ کے کنارے واقع شہر تکریت[1] میں پیدا ہوئے۔ ایک کرد خاندان میں آنکھیں کھولیں اور ایک سپاہی کی حیثیت سے پروان چڑھے۔ آپ کی پیدائش کے زمانہ میں آپ کے والد نجم الدین قلعہ تکریت کے حاکم تھے۔ اور پھر ۵۳۳ھ میں قلعہ بعلبک کے حاکم مقرر ہوئے۔ آپ کے والد کے علاوہ آپ کے چچا اسد الدین شیر کوہ بھی نامی گرامی سپہ سالار تھے۔ غرض کہ فوجوں، قلعوں اور سپہ سالاروں میں آنکھیں کھولیں، پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ بہادری، جفاکشی اور اولو العزمی آپ کے اندر گویا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ فتح مصر کے معرکے میں ان کے سپاہیانہ جوہر کھلے جہاں ان کو سلطان نور الدینؒ نے اصرار کے ساتھ بھیجا تھا اور وہ بادل ناخواستہ گئے تھے لیکن جب مصر فتح ہو گیا اور اس کی باگ ڈور آپ کے

---

[1] صلاح الدین از مولانا احمد حسین الہ آبادی ص ۶

ہاتھ میں آگئی تو آپ میں ایک عجیب تبدیلی پیدا ہوئی۔ قاضی بہاء الدین ابن شداد اور لین پول دونوں لکھتے ہیں کہ فتح مصر کے بعد سلطان کی زندگی یکسر بدل گئی۔ عیش ونشاط اور تفریحات سے انھوں نے توبہ کی۔ جفاکشی کی زندگی اختیار کی۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کی طرف روز بروز بڑھنے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنے اعمال کو بھی پابند آئین کیا اور اپنی زندگی کا مقصد حمایت اسلام اور جہاد قرار دیا۔ سلطان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جب اللہ نے میرے ذریعہ مصر فتح کر دیا ہے تو اب انشاء اللہ بیت المقدس بھی میرے ہاتھ پر فتح ہوگا۔ عیسائیوں کے ساتھ سلطان کے کتنے ہی معرکے ہوئے۔ آخر حطین کی فیصلہ کن جنگ برپا ہوئی، (بروز سنیچر ۲۴ ربیع الآخر ۵۸۳ھ) جس میں سلطان نے دشمنوں کو شکست فاش دی۔ اس فاتحانہ معرکہ نے فلسطین سے عیسائی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور مسیحیوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ بادشاہ گائی اور سپہ سالار ریجی نالڈ دونوں گرفتار ہوئے۔ گائی کے ساتھ سلطان نے اچھا برتاؤ کیا لیکن ریجی نالڈ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ کیونکہ سلطان نے اس کو قتل کرنے کی دوبار قسم کھائی تھی۔ ایک بار جب اس نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کا ارادہ کیا تھا اور دوسری بار جب کہ اس نے دھوکہ سے حاجیوں کے قافلہ پر حملہ کیا تھا۔

۲۷ رجب ۵۸۳ھ ۱۱۸۷ء کو سلطان بیت المقدس میں داخل ہوا۔ اس طرح ۹۰ برس کے بعد بیت المقدس عیسائیوں کے غاصبانہ قبضہ سے پھر اہل اسلام کی تولیت میں آگیا۔ حسن اتفاق دیکھیے، نبی کریم صلعم کو معراج بھی ۲۷ رجب ہی کو ہوئی تھی، جب کہ آپؐ نے بیت المقدس میں تمام انبیاء علیہم السلام کی امامت فرمائی تھی۔

سیرت و کردار سلطان صحیح العقیدہ مسلمان تھا۔ نماز، روزہ وغیرہ دینی

فرائض کا پابند تھا لیکن اسے جس عبادت کا شوق بلکہ عشق تھا جہاد ہے۔
قاضی ابن شداد لکھتے ہیں، جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشے میں سما گیا تھا اور ان کے قلب و دماغ پر چھا گیا تھا۔ یہی ان کا موضوع گفتگو تھا، اسی کا ساز و سامان تیار کرتے رہتے تھے اور اس کے اسباب و وسائل پر غور کرتے تھے[۱]۔

سلطان کی عالی ظرفی اور اسلامی اخلاق سے بہرہ مند ہونے کے تمام مؤرخ قائل ہیں حتیٰ کہ عیسائی مؤرخ لین پول بھی لکھتا ہے "صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنے کو ایسا عالی ظرف اور باہمت ثابت نہیں کیا تھا جیسا کہ اس موقعہ پر ثابت کیا جب کہ یروشلم مسلمانوں کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ اس کی سپاہ اور معزز افسران و ذمہ داران نے جو اس کے تحت تھے شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا اور کسی عیسائی کو گزند نہیں پہنچنے دیا۔
سلطان کا دربار اہل علم و فضل سے کبھی خالی نہیں رہا۔ حفاظ قرآن مختلف اوقات میں سلطان کو قرآن سناتے تھے۔ یہ صرف حافظ اور قاری نہیں ہوتے تھے بلکہ عالم فاضل بھی ہوتے تھے اور ورع و تقویٰ سے بھی ان کی زندگیاں مزیّن ہوتی تھیں۔ سلطان کے باڈی گارڈ بھی حفاظ ہوتے تھے۔ راتوں کو سلطان قرآن سُنتا تھا۔ عذاب و عتاب کی آیتوں پر سلطانؒ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے۔ قرآن کے علاوہ سلطان کو احادیث سے شغف اور محدثین اگر کسی وقت حاضر نہ ہوتے تو خود سلطان ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا[۲]۔

---

[۱] صلاح الدین از مولانا احمد حسین الٰہ آبادی ص۷
[۲] کتاب مذکور ص۱۱

سلطان سے لوگ راہ چلتے استغاثہ کرتے تھے اور سلطان ان کی دادرسی کرتا تھا۔ اس کے دربار میں مدعی اور مدعا علیہ خواہ ان میں دنیاوی لحاظ سے کتنا ہی تفاوت ہوتا ہر ایک کو برابر جگہ دی جاتی۔ چنانچہ ابن زہیر دمشقی نے جو ایک معمولی آدمی تھا سلطان کے بھتیجے تقی الدین پر دعویٰ کیا۔ تقی الدین سلطان کا بھتیجہ ہونے کے علاوہ انتہائی دلیر اور ذہین وفطین ہونے کی وجہ سے ہر دلعزیز تھا۔ مگر سلطان نے دونوں کو عدالت میں ایک ہی مقام میں جگہ دی اور ابن زہیر کی دادرسی کی۔

شیخ حسن عمرو خلاطی نے خود سلطان پر دعویٰ کیا تو سلطان نے اسی طرح مدعا علیہ کی حیثیت سے اپنے گواہ اور ثبوت پیش کیے جس طرح کوئی اور مدعا علیہ ہوتا اور وہ اپنے گواہ اور ثبوت پیش کرتا۔[1]

سلطان سادہ مزاج تھا اس میں تکبر وغرور نام کو بھی نہیں تھا۔ ہمیشہ سادہ لباس میں معمولی آدمیوں کی طرح رہتا تھا۔ ہمیشہ عام دستر خوان پر عام لوگوں کے ساتھ کھانا تناول کرتا تھا۔ سلطان انتہائی حلیم اور بردبار تھا۔ ایک بار سپاہی نے کوئی عرضی پیش کی اور خود پڑھنے لگا۔ قلم دان سامنے نہیں تھا لہٰذا منظوری دستخطوں میں تاخیر ہوئی۔ مجاہد سپاہی بولا آپ متردد کیوں ہیں۔ قلمدان تو وہ رکھا ہے۔ سلطان نے بائیں ہاتھ سے ٹیک لگا کر دائیں ہاتھ سے قلمدان اٹھایا اور دستخط کر دیے۔ سپاہی چلا گیا۔ عبداللہ بن یوسف مصنف "نوادر سلطانیہ" بھی وہاں موجود تھے۔ عرض کیا خلق عظیم کی قرآنی بشارت سے آپ مشرف ہوئے۔ سلطان نے کہا۔۔۔ ضرنا شیئاً قضینا حاجۃً وحصل اللہ۔ اب ہمیں کوئی تکلیف

---

[1] کتاب مذکور ص ۱۴۲ تا ۱۴۴

نہیں ہوئی۔ ہم نے حاجت پوری کی اور ثواب حاصل کیا ــــ،

ایک بار ایسا ہوا کہ سلطان نے خادم سے پانچ بار پانی طلب کیا لیکن خادم یا تو سمجھا نہیں یا دوسری طرف متوجہ تھا۔ چھٹی بار سلطان نے حاضرین سے کہا۔ لوگوں میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں۔ لیکن خادم سے کچھ نہ کہا[1]

سلطان خود تو فرائض و نوافل کا پابند اور اہل علم کا قدرداں تھا ہی اس نے فوجی خدمات پر بھی اہل علم کو مقرر کر رکھا تھا اور اس کے فوجی سپاہی جس طرح اپنے منصبی فرائض ادا کرنے میں چست اور مستعد تھے، صوم و صلوٰۃ اور دیگر ارکان اسلام کے بھی پابند تھے۔

کارنامے سلطان ایوبی کی زندگی کارناموں سے پُر ہے۔ چند کارنامے ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ عبیدی حکومت جو فاطمی خلافت کے نام سے مشہور ہے، دراصل باطنیوں شیعوں اور اسماعیلیوں کا ایک ظالمانہ اور استبدادی اقتدار تھا جو اہل اسلام پر ۲۹۹ھ سے ۵۶۷ھ تک پورے دو سو اڑسٹھ برس مسلط رہا۔ سلطان کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے اس استبداد کا استیصال کیا۔

۲۔ عبیدی حکومت کی مسلط کی ہوئی بلاؤں میں سے ایک بلا شام و فلسطین اور جزیرہ میں چند عیسائی سلطنتوں کا قیام تھا۔ عبیدی عیش و عشرت میں مبتلا رہے اور عیسائی مسلط ہوتے رہے حتیٰ کہ بیت المقدس بھی انھوں نے چھین لیا۔ سلطان نے عیسائیوں کی ایک معمولی سی عکہ نامی سلطنت کے علاوہ سب کا استیصال کر دیا اور مسلم سلطنت کو مستحکم اور وسیع کیا۔

---

[1] کتاب مذکور۔

۳۔ سلطان کا زبردست اور رہتی دنیا تک یادگار رہنے والا کارنامہ یہ ہے کہ بیت المقدس کو عیسائیوں کے تسلط سے ۵۸۳ھ میں آزاد کرایا جو ۹۰ برس سے ان کے تسلط میں تھا اور مسلمان ظلم و بربریت کا شکار تھے۔

۴۔ باطنیوں اور اسمٰعیلیوں کے تسلط سے نجات ملی تو قرآن و سنت اور اسلامی علوم و فنون کا احیاء ہوا۔ علم و دانش کے خشک سوتے پھر سے جاری ہوئے، مدارس قائم ہو گئے۔ علمی و عملی زندگی میں پھر بہار آئی شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام جیسے حق گو اور بے باک مصلح پیدا ہوئے۔ یہ بھی سلطان ہی کا کارنامہ ہے۔

۵۔ سلطان نے قیصر فیڈرک، شاہ انگلستان، شاہ فرانس، شاہ صقلیہ، آسٹریلیا کا لیوپولڈ، برگنڈی کا ڈیوک، فلانڈر کا کاؤنٹ وغیرہ یوروپ کی متحدہ مسیحی یلغاروں کا تنہا مقابلہ کر کے اسلام اور مسلمانوں کی دھاک ایک بار پھر دنیا والوں پر بٹھا دی۔

لین پول لکھتا ہے، تیسری صلیبی جنگ میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر صلاح الدین کی قوۃ کو ٹس سے مس نہ کر سکی[1]

۶۔ اتحاد بین المسلمین بھی سلطان کا ایک کارنامہ ہے چنانچہ کرد، ترکمان عرب، مصری سب مسلمان سلطان کے خادم تھے اور طلبی کا اشارہ پاتے ہی حاضر ہو جاتے تھے۔ حالانکہ ان کی نسل و قوم جدا تھی، ان کے قبائلی غرور اور قومی چشمکوں کے باوجود سلطان کے جہاد فی سبیل اللہ کے جذبہ نے ان میں بھی یہی جذبہ ابھار دیا تھا۔ سلطان صلاح الدین کا مسیحی مصنف لکھتا ہے۔

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت اول ص ۲۵۱

جس طرح ۱۱۸۶ء میں پہلی مرتبہ خدا کی راہ میں کام کرنے کو انھیں طلب کیا تھا اسی طرح آخر تک راہ خدا میں کام کرتی رہیں۔ اس تمام زمانہ میں نہ تو سلطان کا کوئی صوبہ اس سے منحرف ہوا اور نہ کسی ماتحت سردار یا باج گذار ریاست نے اس سے بغاوت کی[1]

۷۔ سلطان نے شورائیت کو زندہ کرنے کی کوشش کی مجلس حرب قائم تھی جو معاملات جنگ میں مشورہ دیتی تھی حتیٰ کہ سلطان کی صحیح رائے پر مجلس کی غلط رائے بھی حاوی ہو جاتی تھی تب بھی سلطان مجلس کی رائے پر عمل کرتا تھا۔[2]

۸۔ غرضکہ سلطان نے روح جہاد کو زندہ کیا اور اسلام کو صرف مذہب بننے سے بچایا اور دین کی جامعیت کو عملاً ثابت کیا۔ جب حیات مستعار کے دن پورے ہو گئے تو سلطان نے ۲۷ صفر ۵۸۹ھ کو علالت کے بارھویں دن سحر کے وقت ۵۷ سال کی عمر میں اپنے رب کے حضور سرخ رو ہونے کے لیے اس دنیا کو خیر باد کہا۔ اِنّا لِلہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

شیخ معین الدین چشتی رح

ایک عظیم مصلح

۵۳۷ھ / ۱۱۴۱ء تا ۶۲۷ھ / ۱۲۳۵ء

شیخ معین الدین چشتی رح سیستان کے رہنے والے تھے۔ ۱۳ سال کے تھے کہ ملک میں بدنظمی وغیرہ کی وجہ سے آپ کے والد نے وطن چھوڑ کر خراسان میں سکونت اختیار فرمائی اور وہیں دو سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ ترکے میں آپ کو میوے کا ایک باغ اور ہوائی چکی ملی۔ ایک دن آپ اپنے باغ میں پانی دے رہے تھے کہ ایک بزرگ شیخ ابراہیم قندوری رح تشریف لے آئے۔ آپ نے ان کا بڑے تپاک سے استقبال کیا اور کھانے کے واسطے پھل پیش کیے۔ شیخ قندوری اپنے نوجوان میزبان کی خاطر تواضع سے بہت خوش ہوئے۔ دو چار انگور کھالیے اور سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا جھولی سے نکال کر آپ کو دیا اور دعائیں دیں۔ آپ نے وہ ٹکڑا تبرک سمجھ کر بڑے شوق سے کھالیا۔ ان بزرگ کی شان استغنا اور دنیا سے بے رغبتی کا آپ نے بڑا اثر لیا۔ کچھ دنوں بعد آپ نے اپنا باغ اور چکی بیچ ڈالی اور جو کچھ رقم حاصل ہوئی اس کا بڑا حصہ غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا اور خود علم دین حاصل کرنے کے لیے سمرقند اور بخارا کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ بخارا میں آپ کا قیام سات آٹھ برس رہا۔ اس عرصہ میں آپ نے قرآن حفظ کرنے کے علاوہ شیخ حسام الدین بخاری رح سے تفسیر،

حدیث، فقہ اور دوسرے دینی علوم حاصل کیے اور ان میں خاصا اونچا مقام حاصل کیا۔ صحبت صالحین کا آپ کو شوق تھا کیونکہ قرآن اور حدیث سے صحبت صالحین کی فضیلت اور اہمیت آپ نے اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ آپ سمجھتے تھے کہ بغیر کسی خدا رسیدہ بزرگ کی صحبت کے میں اپنے نفس اور خواہشات پر قابو نہیں پا سکتا۔ چنانچہ تعلیم سے فارغ ہو کر بزرگوں کی تلاش میں مختلف جگہ گئے۔ اِدھر اُدھر دور دور مارے مارے پھرتے رہے آخر عراق کے شہر ہارون پہنچے۔ وہاں شیخ عثمانی ہارونیؒ ایک بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ آپ نے ان سے ملاقات کی رفتہ رفتہ آپ کو ان سے کافی عقیدت ہو گئی۔ آپ ان سے دھیرے دھیرے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور مرید ہو گئے، خدمت میں حاضر رہنے لگے۔ سفر اور حضر ہر جگہ ساتھ رہتے۔ چوبیس[۲۴] برس اسی طرح گذار دیے۔ اگرچہ اپنے شیخ کے ہمراہ حج بیت اللہ سے مشرف ہو چکے تھے لیکن جب شیخ سے سفر اور سیاحت کی اجازت حاصل کی تو پہلے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے آپ نے ہندوستان کا ارادہ فرمایا۔ چالیس دوسرے بزرگ آپ کے ہمراہ تھے۔ مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کرتے اور دین کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہوئے یادگار محمد والی سبزوار کے علاقہ میں پہنچے۔ کہتے ہیں یادگار محمد بے دین تھا۔ اس نے بغیر اجازت اپنے علاقہ میں آنے اور شاہی باغ میں ٹھہرنے پر آپ کو بہت برا بھلا کہا لیکن بعد میں آپ کے اخلاق سے اس قدر متاثر ہوا کہ توبہ کر کے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اشاعت دین کے لیے آپ کے ہمراہ ہو لیا۔ سبزہ وار سے آپ ملتان آئے اور پھر لاہور ہوتے ہوئے دہلی تشریف لے آئے۔ راہ میں جہاں جہاں قیام کیا ہر جگہ اسلام کی اشاعت اور دعوت و تبلیغ کا مشن آپ نے جاری رکھا۔ چنانچہ آپ کی کوششوں سے اچھی خاصی تعداد میں لوگوں نے دین حق قبول کیا۔ مستقل قیام کے لیے

آپ نے اجمیر کو پسند کیا۔ کیونکہ اجمیر ان دنوں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ پرتھوی راج کا دارالسلطنت تھا۔ آپ نے بھی اشاعت دین کا مرکز اسی کو قرار دیا کیونکہ راجدھانی میں رات دن ہر طرف سے قافلے آتے رہتے تھے اور یہاں بیٹھ کر چاروں طرف پیغام حق پہنچایا جا سکتا تھا۔ پرتھوی راج نے پہلے تو آپ کو کسی مسلم حکمران کا جاسوس خیال کیا اور ستایا بھی۔ پھر آپ کی پاکیزگی، تعلیم اور بلند کردار سے مطمئن ہو گیا۔ لیکن جب چند درباری بھی آپ کے عقیدت مند ہو گئے اور چاروں طرف آپ کا چرچا ہونے لگا، ادھر ادھر سے لوگ آتے اور عقیدت مند ہو کر جاتے تو پرتھوی راج نے پھر خطرہ محسوس کیا۔ اس نے پھر ستانا شروع کیا۔ آپ کو متاثر کرنے بلکہ یوں کہیے کہ لوگوں کے دلوں سے آپ کی عقیدت دور کرنے کی غرض سے دو مشہور جادوگر شادی دیو اور اجے پال کو بلایا اور آپ کے پاس بھیجا۔ لیکن آپ پر ان کا جادو چل نہ سکا بلکہ وہ دونوں خود متاثر ہو گئے۔ کیوں کہ انھوں نے جب دیکھا کہ ہمارا فن یہاں پر فیل ہو رہا ہے حالانکہ ہم اپنے فن میں کامل ہیں، ہو نہ ہو، ان بزرگ کے ساتھ خدائی طاقت ہے اور یہ یقیناً خدا رسیدہ ہیں۔

آپ نے پرتھوی راج کو بھی اسلام کی دعوت دی تھی لیکن اس کی قسمت میں دین حق نہ تھا۔ آپ کی دعوت کو اس نے رد کر دیا۔ آخر کار جنگ ترائن میں شکست کھائی اور مارا گیا۔

کارنامے

آپ کے کارناموں کے سلسلہ میں بس اتنا کہنا کافی ہے۔

ع جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

ہندوستان میں اسلام کی عمومی اشاعت کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ آپ کی ذات، اخلاق اور روحانیت اور شریعت و طریقت کی جامع تھی۔ لہٰذا اجمیر نے ایک اسلامی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔ آپ نے دیگر صوفی بزرگوں کی طرح

لامرکزی نظام قائم کیا۔ مرکز تبلیغ اجمیر سے ہر ہر مبلغ یا ہر ہر تبلیغی سینٹر کو باقاعدہ ہدایات دینے، رپورٹیں وصول کرنے اور باہم بیٹھ کر کام کو آگے بڑھانے کی تدبیریں سوچنے اور اسکیمیں بنانے کا کوئی نظم نہیں تھا اور یہ اس دور میں اگر ناممکن نہیں تھا تو آج کے دور کی طرح اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر ہی ہر دور کے داعیانِ حق نے تدابیر اختیار کی ہیں۔ شخصی اور استبدادی حکومتوں میں لامرکزی نظام ہی مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے چنانچہ آپ نے یہی کیا کہ اپنے مریدوں میں سے جس کو مناسب خیال کیا اور یہ سمجھا کہ یہ تکمیل کے مدارج طے کر چکا ہے اس کے سینے میں اشاعت دین کے جذبات کی بھٹی اچھی طرح دہکنے لگی ہے اسے خلافت سے سرفراز کیا اور کسی خاص علاقہ میں متعین کر دیا کہ جاؤ اشاعت حق کا فریضہ انجام دو اور زندگی بھر اپنے مشن میں سرگرم رہو۔ چنانچہ صوفیاء کرام کے خلفاء نے اپنے مرشد کے اشاروں پر اپنی زندگیاں اپنے نصب العین کے لیے وقف کر دیں اور پھر چراغ سے چراغ یونہی جلتا رہا۔ خلفاء کے خلفاء نے یہی طریقہ اختیار کیا چنانچہ خواجہ صاحب نے بھی اپنے خلفاء کو مختلف مقامات پر متعین فرمایا۔

مثلاً خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو آپ نے دہلی میں متعین فرمایا لیکن آپ خود اجمیر ہی میں مقیم رہے اور بندگان خدا کو دین حق سے روشناس کراتے رہے۔ سیر الاولیا کے مصنفؒ لکھتے ہیں۔

"اس ملک میں جس کو دولت اسلام ملی اور قیامت تک جو بھی اس دولت سے مشرف ہوگا نہ صرف وہ بلکہ اس کی اولاد در اولاد اور نسل در نسل سب ان کے نامۂ اعمال میں ہوں گے اور اس میں قیامت تک جو بھی اضافہ ہوتا رہے گا اور دائرۂ اسلام وسیع تر ہوتا رہے گا۔ قیامت تک اس کا ثواب شیخ الاسلام

معین الدین حسن سنجریؒ کی روح کو پہنچتا رہے گا۔" صاحب ماثر الکرام لکھتے ہیں "کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان پر بزرگان چشتیہؒ کا قدیم حق ہے۔" سیر الاقطاب میں ہے: "ہندوستان میں ان کے دم قدم سے اسلام کی اشاعت ہوئی۔" آئین اکبری میں ہے "اجمیر میں قیام کیا اور اسلام کا چراغ بڑی آب وتاب کے ساتھ روشن کیا اور جوق در جوق لوگوں نے ایمان کی دولت پائی۔"

ان حوالوں کے بعد علی میاں لکھتے ہیں۔

تقریباً نصف صدی ارشاد و تلقین، اسلام کی اشاعت اور داعیان اسلام اور اہل قلوب کی تعلیم و تربیت اور یاد حق میں سرگرمی کے ساتھ مشغول رہ کر ۹۰ سال کی عمر میں ۶۲۷ھ میں اس وقت رحلت فرمائی جب ہندوستان میں ان کا لگایا ہوا پودا جڑ پکڑ چکا تھا اور دارالحکومت دہلی میں ان کے جانشین و تربیت یافتہ شیخ وقت (خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ) ارشاد و ہدایت کے کام میں سرگرم و منہمک تھا اور ان کا عقیدت مند و حلقہ بگوش سلطان شمس الدین التمش اسلامی حکومت کی توسیع و استحکام اور عدل گستری و خلق پروری میں مشغول تھا۔[1]

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت سوم ص۲۱

شیخ عزالدین ابن عبدالسلامؒ

ایک عظیم مصلح

۵۷۸ھ تا ۶۶۰ھ

سلطان صلاح الدینؒ نے فاطمی خلافت جو درحقیقت شیعی اسمٰعیلی اور باطنی استبداد تھا اس کا استیصال کرکے اور مصر فتح کرکے جو ایک علمی تحریک پیدا کی تھی اس کے نتیجے میں بڑے بڑے علماء اور مصلحین پیدا ہوئے۔ مثلاً فخرالدین ابن عساکرؒ، سیف الدین آمدیؒ اور ابو محمد القاسم ابن عساکرؒ وغیرہ۔

شیخ عزالدین انھیں بزرگوں کے شاگرد رشید تھے جو اپنے اساتذہ کرام سے بھی علم وفضل اور اصلاحی جدوجہد میں آگے نکل گئے اور فضیلت کا بلند مقام حاصل کیا۔

معاصرین میں عموماً چشمک ہوتی ہے اور ایک دوسرے کی فضیلت کا اعتراف کرنے میں ہم زمانہ لوگ بخل اور شیخی نفس کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن شیخ الاسلام ابن عبدالسلام کے معاصرین آپ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ علامہ ابن دقیق العید نے آپ کو سلطان العلماء لکھا ہے۔ حافظ عبدالعظیم المنذری نے جب کہ شیخ مصر تشریف لے گئے تھے فتویٰ دینا بند کر دیا اور کہا شیخ الاسلام ابن عبدالسلام جس جگہ موجود ہوں وہاں کسی اور کو فتویٰ دینا درست نہیں۔ شیخ جمال الدین

ابن حاجب نے آپ کو امام غزالیؒ سے بھی بلند قرار دیا۔ امام ذہبی نے لکھا، فقہ اور زہد و ورع میں آپ کو کمال حاصل تھا اور آپ درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔

شیخ نے ایک عرصہ تک دمشق میں زاویۂ غزالیہ میں درس دیا اور جامعِ اموی میں امام و خطیب رہے۔ آپ نے اپنے زمانے میں رائج بدعات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سلطان الملک الکامل نے عہدۂ قضا بڑے اصرار سے پیش کیا جسے شیخ نے بڑی مشکل سے اور بڑی شرطوں کے ساتھ قبول کیا اور جب آپ نے مہتمم قصرِ شاہی کو ناقابل شہادت قرار دیا تو اس عہدہ سے استعفیٰ بھی دے دیا۔

کارنامے صاحب "تاریخ دعوت و عزیمت" نے شیخ کے جن کارناموں کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ شیخ کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ مروجہ بدعات کا رد اور استیصال کیا۔ صلوٰۃ الرغائب اور صلوٰۃ نصف شعبان کی کھل کر مخالفت کی اور ان کا بدعت ہونا ثابت کیا۔ صلوٰۃ الرغائب ایک نماز تھی جو ۲۷ رجب کو پڑھی جاتی تھی اس کی بارہ رکعتیں تھیں اور خاص ترکیب سے پڑھی جاتی تھی اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی جاتی تھی۔ یہ نماز ۴۸۰ھ میں ایجاد ہوئی اور بدعاتِ عام کی طرح تیزی سے پھیل گئی۔ اسی طرح پندرھویں شعبان کو سو رکعتیں خاص ترکیب سے پڑھی جاتی تھیں۔ یہ نمازیں بدعت ہیں۔ علامہ ابن سبکی نے انھیں بدعتِ مذمومہ لکھا ہے۔ امام نوویؒ نے ان کو موضوع، منکر اور قبیح قرار دیا ہے۔

غرض کہ چونکہ یہ نمازیں سنّتِ نبویؐ سے ثابت نہیں ہیں لہٰذا بدعت ہیں اور کلُّ بدعۃٍ ضلالۃ کے پیشِ نظر گمراہی ہیں۔ بہرحال بدعات کا استیصال آپ کا ایک کارنامہ ہے۔

۲۔ شیخ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے دور کے حکام اور

فرمانرواؤں کو خانہ جنگی سے باز رکھا؛ جہاد کی طرف متوجہ کیا اور ان کے غیر دینی اقدامات پر برملا ٹوکا اور جان کا خطرہ بھی مول لے کر ان کی دینی بے غیرتی کی مخالفت پر قائم رہے۔ چنانچہ :۔

الف :۔ فخر الدین عثمانی جو مصر کے قصر شاہی کا مہتمم اور سلطنت مصر کا کرتا دھرتا تھا، اس نے ایک مسجد کی چھت پر طبل خانہ بنوایا اور وہاں نقارہ بجنے لگا۔ شیخ نے بحیثیت قاضی اس عمارت کو منہدم کرنے کا حکم دیا اور فخر الدین کو ناقابلِ شہادت قرار دیا۔ شیخ کے فتویٰ کا اس قدر اثر تھا کہ اسی زمانے میں الملک الصالح سلطانِ مصر نے خلیفۂ بغداد کی خدمت میں ایک سفیر کے ذریعہ کوئی پیغام بھیجا۔ دربار خلافت میں سفیر سے دریافت کیا گیا۔ تم نے یہ پیغام خود سلطانِ مصر کی زبان سے سنا ہے۔؟

سفیر نے کہا شاہی مہتمم فخر الدین سے سنا ہے خلیفہ نے کہا فخر الدین ناقابلِ اعتبار ہے۔ شیخ عز الدین نے اسے ناقابل شہادت قرار دیا ہے۔

(ب) عید کے دن کا واقعہ ہے۔ بادشاہ اپنے تزک و احتشام کے ساتھ تخت پر بیٹھا تھا۔ دونوں طرف فوجی کھڑے تھے۔ امرار اور حکام حاضر ہو کر آداب و سلام بجا لا رہے تھے۔ بھرے دربار میں شیخ نے سلطان کو نام لے کر خطاب کیا۔ ایوب! خدا کو کیا جواب دوگے؟ خدا جب پوچھے گا کیا میں نے تم کو حکومت مصر اس لیے دی تھی کہ کھلم کھلا شراب فروخت ہو اور دوسری بدکاریاں ہوتی رہیں، سلطان نے کہا کیا یہ واقعہ ہے؟ شیخ نے بلند آواز سے کہا، جی ہاں۔ فلاں جگہ آزادی سے شراب پی جاتی ہے اور تم یہاں بیٹھے داد عیش دیتے ہو، سلطان نے کہا! اس میں میرا قصور نہیں، وہ میرے والد کے زمانہ کا میخانہ ہے۔

شیخ نے فرمایا۔ کیا تم بھی انھیں لوگوں میں سے ہو جو کہتے ہیں اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا

عَلیٰ اُمَّۃٍ، ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اسی پر چلتے ہیں۔ سلطان نے فوراً میخانہ بند کرنے کا حکم دیا۔

(ج) تاتاریوں نے مصر کا رخ کیا ان کی ہیبت تو عالم اسلام پر طاری تھی ہی، سلطان اور حکام بھی مرعوب تھے۔ ان میں مقابلے کی ہمت بھی نہ تھی۔ شیخ نے ان کو جھنجھوڑا، جوش جہاد ان میں پیدا کیا، ہمت بندھائی۔ سلطان نے سرمایہ کی کمی کا اظہار کیا اور تاجروں سے قرض حاصل کرنے کی تجویز رکھی۔ شیخ نے کہا میں تاجروں سے قرض حاصل کرنے کی تجویز رکھے لیتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے قلعہ کے جواہرات اور بیگمات کے زیورات لاکر سامنے رکھیے۔ ارکان سلطنت اور بڑے بڑے حکام اور افیسران بھی اپنی بیگمات کے زیورات لاکر دیں۔ میں ان کے سکے ڈھلواؤں گا اور یہ سرمایہ فوجی اور جنگی ضرورت میں صرف کروں گا۔ پھر اگر ضرورت ہوگی تو عام تاجروں سے اپیل کروں گا۔ تاتاریوں کے خوف اور شیخ کی عظمت سے مجبور ہو کر سلطان اور ارکان سلطنت نے اپنا پوشیدہ سرمایہ جواہرات اور زیورات حاضر کر دیے۔ غرض کہ تاتاریوں سے مقابلہ ہوا اور خدا کے فضل سے فتح حاصل ہوئی۔

۳۔ شیخ کی زندگی میں مصر پر کئی سلاطین نے حکومت کی۔ جب آپ مصر تشریف لائے تھے تو مصر پر ایوبی خاندان حکومت کر رہا تھا۔ الملک الصالح نجم الدین، الملک المعظم توران شاہ کے بعد ترکی النسل سلاطین کا دور آیا۔ لیکن ہر ایک شیخ کا نیازمند رہا۔ خصوصاً سلطان الملک الظاہر بیبرس شیخ کا بڑا ادب شناس تھا۔ تاتاریوں کے سرخیل ہلاکو خاں نے جب بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور خلیفہ مستعصم باللہ کو شہید کر ڈالا تو خلافت بھی ختم ہو گئی۔ یہ حادثۂ جانکاہ ۶۵۶ھ میں رونما ہوا تھا۔ شیخ کی کوششوں سے سلطان بیبرس

نے ۵۵۹ھ میں خلیفہ مستعصم باللہ کے چچا ابوالقاسم احمد کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔ سب سے پہلے شیخ عز الدین رح نے پھر سلطان نے پھر قاضی القضاۃ تاج الدین وغیرہ نے بیعت کی۔ اس طرح تین سال کے بعد پھر خلافت قائم ہوگئی جس کا سلسلہ صدیوں تک قائم رہا۔ آخر مصطفےٰ کمال پاشا نے تاریخ اسلامی میں سب سے پہلے خلافت کے بجائے سیکولر حکومت قائم کی اور اسلامی قانون کے بجائے غیر اسلامی قانون نافذ کیا۔ اس سے پہلے یہ کافرانہ جرأت کسی کو نہ ہوئی تھی۔

۴۔ شیخ ابھی شام ہی میں تھے کہ ملک اشرف کے جانشین صالح اسمٰعیل نے ملک صالح نجم الدین ایوب سلطان مصر کے مقابلے میں انگریزوں سے مدد چاہی اور حق خدمت کے طور پر صیدا، اور تقیف کے شہر اور چند قلعے ان کو دے دیے۔ فرنگیوں کی ہمت اتنی بڑھی کہ مسلمانوں کے شہروں میں آتے اور ہتھیار خرید کرے جاتے۔ شیخ عز الدین رح ابن عبدالسلامؒ نے فتویٰ دیا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار بیچنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ ان ہتھیاروں سے مسلمانوں کا گلا کاٹیں گے۔ اس فتویٰ پر صالح اسمٰعیل نے شیخ کو گرفتار کرلیا۔ ایک عرصہ تک قید میں رہے پھر دمشق سے بیت المقدس منتقل کیے گئے۔ صالح اسمٰعیل بیت المقدس آیا تو شیخ دوبارہ گرفتار کرلیے گئے، حتیٰ کہ سلطان نے فرنگیوں اور صالح اسمٰعیل کے متحدہ محاذ کو شکست دی تب شیخ کو رہائی ملی۔

غرضکہ سیاسی اور اجتماعی پہلو کی اصلاح اور سدھار کا پہلو بھی شیخ کے پیش نظر رہا حتیٰ کہ اس سلسلہ میں شیخ کو قید و بند کے مصائب بھی جھیلنا پڑے۔

امام ابن تیمیّہ رح

ایک مجدّد اور مجاہد

۶۶۱ھ تا ۷۲۸ھ
۱۲۶۲ء ۱۳۲۷ء

امام ابن تیمیّہ رح نے زبان، قلم اور تلوار تینوں سے کام لیا اور زندگی بھر اصلاح ملّت اور احیاءِ دین کی کوشش کرتے رہے۔ عام مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے چونکایا۔ امت مسلمہ کے تن مردہ میں تازہ روح پھونکی اور جب زبان و قلم کے علاوہ شمشیر و سنان سے جہاد کی ضرورت ہوئی تو اس سے بھی خوب خوب کام لیا اور کامیاب رہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے تمام علوم دینیہ اور دنیاویہ کا جائزہ لیا اور ہر ایک کو قرآن و سنت کی کسوٹی پر کسا اور پھر ہر علم و فن پر تنقید اور تبصرہ کیا غرض کہ امام ابن تیمیّہ رح صرف ایک علامہ یا ایک مصلح ہی نہیں ہیں بلکہ ایک مجدد اور مجاہد بھی ہیں۔

نام و نسب امام ابن تیمیّہ رح کا نام احمد، لقب تقی الدین ہے والد کا نام عبدالحلیم ابن عبدالسّلام ہے۔ آپ کے دادا عبدالسلام کی پردادی کا نام تیمیہ تھا جو نہایت قابل اور پرہیزگار تھیں، وعظ بھی کہتی تھیں۔ انھیں بزرگ خاتون کی طرف منسوب ہو کر ابن تیمیّہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

آپ کے خاندان میں کتنے ہی بزرگ ہوئے جو ابن تیمیہ ہی کے نام سے مشہور تھے۔

اس خاندان میں بعض خواتین بھی اہل تقویٰ اور اہل علم گذری ہیں۔ مثلاً ام البدر بنت فخر الدین ابن تیمیہ، بنت عبد اللطیف، زینب بنت عبد اللہ ابن تیمیہ۔ زینبؒ امام ابن تیمیہؒ کی استاذ بھی ہیں۔

آپ مقام حرّان میں پیدا ہوئے جو ملک شام میں علوم وفنون کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت رکھتا ہے بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان جندی کا قصر بھی یہیں تھا جب کہ تاتاری غارت گر اسلامی ممالک، اسلامی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کو تہس نہس اور تباہ وبرباد کرتے ہوئے شام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دار الخلافہ بغداد دنیا کا عظیم ترین شہر بھی تباہ ہو چکا تھا۔ اسی حالت میں ۶۶۷ھ میں آپ کے والد حرّان سے مع اہل وعیال نکلے۔ تاتاری بھی پیچھے لگے ہوئے تھے۔ مگر یہ مختصر قافلہ بچ بچا کر نکل گیا۔ اس وقت امام صاحب چھ برس کے تھے۔

تعلیم وتربیت آپ کے والد نے دمشق میں آپ کو تحصیل علم میں لگا دیا۔ آپ نے بڑے شوق وذوق اور محنت وجانفشانی سے علم حاصل کیا۔ دس برس کی عمر میں علم صرف ونحو، اور ادب میں خاصا ملکہ پیدا کر لیا اور ۱۷ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے فتویٰ دینے کی استعداد حاصل کر لی۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا آپ کے نامور اساتذہ کی فہرست میں ایک عالمہ فاضلہ زینب نامی خاتون بھی ہیں۔ ۶۸۱ھ میں دار الحدیث سکریہ میں پہلا درس دیا اس وقت آپ کی اس قدر شہرت ہو چکی تھی کہ بڑے بڑے علماء آپ کے درس میں شریک ہوئے حتیٰ کہ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) شیخ بہاء الدین بھی شریک

ہوئے۔ آپ کے علم وفضل، قابلیت اور مہارت کی اس قدر شہرت ہوئی کہ صرف ۳۰ برس کی عمر میں قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن آپ نے انکار کر دیا۔

قوۃ حافظہ جن شخصیتوں نے بھی دنیا میں کوئی علمی کارنامہ انجام دیا ہے ان کی قوۃ حافظہ یقیناً غیر معمولی رہی ہے لیکن تاریخ میں وہ حضرات انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جنھیں امام ابن تیمیہؒ جیسی قوت حافظہ قدرت نے عطا کی ہو۔ آپ میں یہ قوت بچپن ہی سے نمایاں تھی۔ لڑکپن ہی کا واقعہ ہے کہ چند حدیثیں لکھیں، دو چار بار انھیں دہرایا اور پھر زبانی فرفر سنا دیں۔ پھر جب جوانی کا عالم آیا تو آپ کو ہم عصر علماء سے علمی مباحثے کرنا پڑے۔ ان مباحثوں اور مناظروں میں آپ کو جو غلبہ حاصل ہوا وہ اسی خداداد قوۃ کا کرشمہ تھا۔ آپ نے جیل میں چند کتابیں تصنیف فرمائیں، ان میں احادیث درج فرمائیں۔ علماء کے اقوال پیش کیے، محدثین اور مؤلفین کے نام پر بحث لائے مختلف کتابوں کے حوالے دیے حالانکہ جیل میں تلاش کے باوجود امام ذہبیؒ کہتے ہیں ایک غلطی بھی نہیں ملی۔

حلب کے ایک شیخ دمشق آئے۔ ابن تیمیہؒ کے حافظہ کی شہرت سنی تو ملاقات اور امتحان کا اشتیاق ہوا۔ بازار میں آپ کا پتہ معلوم کیا تو ایک درزی نے شیخ کو اپنی دکان پر بٹھا لیا کہ وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔ ان کا راستہ یہی ہے۔ کچھ دیر بعد درزی نے ایک لڑکے کو آواز دی یہ ابن تیمیہؒ تھے۔ کتابیں ساتھ تھیں۔ شیخ نے دو بار کچھ حدیثیں اور سندیں املا کرائیں اور ابن تیمیہؒ نے دونوں مرتبہ لکھنے اور چند بار دہرانے کے بعد زبانی سنا دیں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز واقعہ آپ کے لڑکپن ہی کا ہے۔ آپ کے والد آپ کے بہن بھائیوں وغیرہ کو لے کر کسی

تفریح گاہ جا رہے تھے۔ آپ سے بھی چلنے کو کہا اور اصرار کیا لیکن آپ نہیں گئے۔ واپس آکر تفریح کا لطف آپ کے سامنے بیان کر کے آپ کے والد نے کہا تم نے خواہ مخواہ اپنے کو محروم رکھا۔ آپ نے کہا میں نے یہ کتاب زبانی یاد کر لی اگر آپ کے ساتھ جاتا تو یہ کام کس طرح ہوتا۔ آپ کے والد نے امتحاناً کتاب ہاتھ میں لی اور کئی جگہ سے سنی۔ آپ نے فر فر سنا دی۔ یہ تھا آپ کا حافظہ اور علم کا شوق، تب ہی تو آپ اپنے ہمعصروں سے بازی لے جانے میں کامیاب ہوئے۔

گہری نظر

غور و فکر اور تدبر سے کام لینا آپ کی عادت تھی تحقیق اور تجسس آپ کی فطرت تھی۔ کبھی کبھی ایک ایک علمی گتھی کو سلجھانے کے لیے کئی کئی راتیں آنکھوں میں کاٹ دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بحر علم میں غواصی کر کے نہ معلوم کتنے گوہر نایاب آپ نے نکالے ہیں اور انھیں اپنی تصانیف میں جا بجا ٹانکا ہے۔

حافظہ کے ذریعہ آپ نے نقل کے موتی اکٹھا کیے، گہری نظر اور عمیق مطالعہ کے ذریعہ عقل کے موتی اکٹھا کیے۔ چنانچہ روایت اور درایت دونوں قسم کے موتیوں سے آپ کی تصانیف مزین ہیں۔ جو چاہے آپ کی کتابوں سے یہ موتی رول لے اور اپنی زندگی کو ان سے مزین کرے اور تابناک بنالے۔

حاضر دماغی

آپ کی حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ اپنے مدمقابل کو آپ عاجز اور درماندہ کر دیتے تھے وہ آپ کے برجستہ جواب پر حیرت اور بے بسی کے عالم میں آپ کا منہ تکتا رہ جاتا تھا۔ آپ کی اسی خوبی نے آپ کے مخالفوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ آپ کے مقابلے پر آتے ہوئے جھجکتے تھے اور جو کوئی آپ کی حاضر دماغی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آپ کے سامنے آجاتا

اسے منہ کی کھانی پڑتی تھی۔ آپ اس کے دانت کھٹے کر دیتے تھے پھر اس بے چارہ کی حالت قابل دید ہوتی تھی۔

غرضکہ بحث واستدلال میں آپ میں سے کوئی بازی نہ لے جا سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کے مخالف فقیہوں اور قاضیوں نے دوبارہ آپ کو قید میں ڈلوادیا۔ آپ کی حاضر دماغی کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مسئلہ تقدیر کے انکار میں کسی شخص نے کچھ اشعار کہے۔ امام صاحب نے کھڑے ہو کر اس کے رد میں سو سے زیادہ برجستہ اشعار پیش کیے۔ اس شخص کے پیش کردہ اشعار اور آپ کی پوری نظم عقود دُرّیہ میں موجود ہے۔

اتباع قرآن وسنّت

نہ صرف اخلاق وکردار اور عمل میں بلکہ نظر و فکر اور علم کے میدان میں بھی آپ قرآن وسنت ہی پر نگاہ رکھتے تھے۔ دلائل شرعیہ سے جو بات جس طرح ثابت ہوتی، اس کو اسی طرح آپ دانتوں سے مضبوط پکڑ لیتے تھے۔ جو مسئلہ بھی آپ کے سامنے پیش ہوتا آپ اس کو کتاب وسنّت اور آثارِ سلف رح کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ لوگوں کی تائید اور مخالفت کی قطعاً پروا نہیں کرتے تھے۔ مروجہ عقائد کی پیروی کے آپ قائل نہیں تھے بلکہ آپ ہمیشہ شرعی دلائل کی پیروی کرتے تھے۔

اپنے علم اور قرآن وسنّت کے مطالعہ کی بنیاد پر انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ رسول اللہ صلعم سے استغاثہ، استمداد اور استعانت کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں ہے۔ بغیر کسی جھجک اور بلا کسی تامل کے آپ نے اپنی اس تحقیق کا اظہار اور اعلان کیا۔ بہت سے لوگ اس بات پر آپ کے مخالف ہو گئے، دشمن بن گئے لیکن آپ کی رائے کوئی بدل نہ سکا۔ آپ کے شاگرد ابوحفص لکھتے ہیں جب امام صاحب پر حق واضح ہو جاتا تھا تو آپ اسے دانتوں سے

مضبوط پکڑ لیتے تھے۔ خدا کی قسم میں نے ان سے زیادہ کسی کو بھی رسول اللہ صلعم کی تعظیم میں سخت اور بے لچک نہیں دیکھا۔ آپ اتباع رسولؐ میں حریص اور اس کی تائید میں آگے آگے رہنے والے تھے۔ آگے استاذ ابو زہرہ لکھتے ہیں۔ یہی وہ صفت تھی جس نے امام صاحب کو مجدّد اسلام بنا دیا تھا اس لیے کہ آپ دوسروں کی رائے سے متاثر ہوئے بغیر صرف دلائل شرعیہ پر نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ تجدید دین کا فریضہ ادا کرنے میں آپ کامیاب ہوئے وہ غبار جو اسلام کے رخ زیبا پر مرورِ ایام سے چھایا گیا تھا، آپ اسے صاف کرنے میں کامیاب و کامران ہوئے۔

خلوص اخلاص، قلب کو نور حقیقت سے بھر دیتا ہے، ذہن و فکر کو صحیح رخ عطا کرتا ہے، ادراک اور شعور کو جلا بخشتا ہے، استقامت عطا کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ فکر مستقیم، قول مستقیم اور عمل مستقیم کی توفیق ملتی ہے ـــــ طلب حق اور جستجوئے حق میں چونکہ آپ مخلص تھے اس لیے آپ کو خدا نے علم حقیقت کی توفیق بخشی تھی۔ حتیٰ کہ آج بھی آپ کی مخلصانہ تحریریں مطالعہ کرنے والوں کو خلوص اور للّٰہیت سے مالا مال کرتی ہیں اور کوئی مخلص آپ کی تحریروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کا اخلاص خصوصیت کے ساتھ چار چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

- اپنی تحقیق رائے کو آپ لوگوں کی مخالفت کے باوجود برملا ظاہر فرما دیا کرتے تھے۔
- آپ نے زندگی بھر قلم اور تلوار اور اپنے عمل و کردار سے جہاد کیا۔
- دنیا کی عزت، شہرت، دولت اور جاہ و منصب کی آپ نے کبھی خواہش نہیں کی، حتیٰ کہ چیف جسٹس کا عہدہ پیش کیا گیا تو آپ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

• آپ نے ان لوگوں بھی معاف کر دیا جو آپ کے خون کے پیاسے تھے اور جانی دشمن تھے۔

غرضکہ مجاہدانہ زندگی، دنیا سے زہد اور عفو و درگذر کی فراوانی کی صفات سے آپ کا خلوص ٹپکتا ہے۔

قدرتِ کلام آپ ایک بڑے خطیب اور آتش بیان مقرر تھے۔ شعلہ بیانی آپ کا نمایاں وصف تھا۔ آپ کے قلم میں بھی بڑا زور تھا۔ شعلہ نگاری اور پر اثر انشاپردازی میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اصل میں فصاحت و بلاغت آپ کا موروثی جوہر تھا۔ آپ کے والد کے حسنِ کلام کی دھوم تھی۔ آپ کے آبا و اجداد میں کتنے ہی بزرگ ایسے ہوئے ہیں جن کی فطرت میں خطابت کا کمال موجود تھا ــــ قرآن کی کثرتِ تلاوت اور احادیث نبویؐ کا حفظ بھی قدرتِ کلام اور فصاحت و بلاغت میں مہارت کا سبب تھا۔

شجاعت آج کل علماء، صرف مسجد و مکتب اور تسبیح و مصلّٰی کے شہسوار نظر آتے ہیں اور جو سیاست کے میدان میں آتے ہیں وہ عموماً اسلام کے نظریۂ سیاسی کو بالائے طاق رکھ کر آتے ہیں۔ لیکن امام ابن تیمیہؒ ان کمزوریوں سے پاک تھے۔ آپ نے زندگی کی ہماہمی سے پورا پورا تعلق رکھا لیکن سیاست و اجتماعیت میں بھی اسلام کا دامن تھامے رہے، دائرۂ شریعت سے قدم باہر نہیں رکھا۔ یہ آپ کی شجاعت اور بہادری کا ایک رُخ تھا جو آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تاتاریوں اور نصیریوں کے مقابلہ میں آپ نے جہاد بالسیف کیا۔ میدان جنگ میں آپ سے بڑھ کر کوئی دلیر نہ ہوتا تھا جو لوگ ساری ساری عمر میدان جنگ میں داد شجاعت دے چکے

ہوتے تھے آپ اُن سے بھی بازی لے جاتے تھے۔

فراست ذہانت، فطانت اور عقل کی تیزی کی صفت بھی آپ میں نمایاں تھی۔ آپ کی ذہانت، خفیہ اسرار کا سُراغ لگا لیتی تھی۔ آپ کا ظن، مشاہدہ کا کام کرتا تھا۔ آپ نے تاتاریوں کی کمزوری بھانپ لی تھی اور قسم کھا کر کہہ دیا تھا کہ مصر و شام کا لشکر کامیاب ہوگا۔ بات یہ تھی کہ لوگ تاتاریوں کی قوت سے نہیں بلکہ دہشت سے شکست کھا رہے تھے۔ امام صاحب کے حوصلے سے لوگوں کا حوصلہ بلند ہو گیا اور دہشت دور ہو گئی۔

آپ کی فراست کا یہ عالم تھا کہ دمشق کے بازار میں ایک طالب علم کو دیکھا اسے بلایا اور کچھ رقم اسے دی۔ پھر فرمایا اس سے کام چلاؤ۔ آگے اللہ مالک ہے۔ حالانکہ اس شخص نے اپنی حاجت قطعاً بیان نہیں کی تھی یہ صرف آپ کی فراست تھی جس سے آپ نے اس کی حالت زار کو تاڑ لیا تھا۔

جہاد علامہ ابن تیمیہؒ نے سیاسی اور ملکی خدمات بھی انجام دیں۔ علامہ جیسا بالغ النظر اس حقیقت سے کس طرح ناواقف رہ سکتا تھا کہ مذہب و سیاست ایک ہی ہیں اور جب بھی مذہب و سیاست میں تفریق ہوتی ہے، تو فقط چنگیزی رہ جاتی ہے۔

۶۷۸ھ میں جب کہ علامہ ابھی صرف ۱۸ سالہ نوجوان تھے ہلاکو خاں کے بیٹے غازان خاں نے شام پر حملہ کیا۔ سلطان ناصر شاہِ مصر نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ غازان خاں نے حمص پر قبضہ کر لیا۔ اس خبر سے کہ غازان آرہا ہے دمشق میں اس قدر ابتری پھیلی کہ لوٹ مار شروع ہو گئی اور نظم قائم نہ رہ سکا۔ غازان کے پاس علامہ خود تشریف لے گئے اور امن کا پروانہ حاصل کیا لیکن اس کی فوج نے شہر پر غارت گری شروع کر دی۔ امام ابن تیمیہؒ نے شیخ الشیوخ نظام الدین محمودؒ

کو ہمراہ لے کر شہر کا نظم قائم کیا اور غازان سے دوبارہ ملاقات کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق چھوڑ کر تاتاری فوجیں بیت المقدس کی طرف بڑھیں اور ہزاروں افراد گرفتار کر لیے گئے۔ امام ابن تیمیہؒ پھر غازان سے ملے اور قیدیوں کو آزاد کرا لائے۔

۶۹۹ھ میں پھر غازان نے بڑے زور شور سے حملہ کی تیاریاں شروع کیں۔ اس کے دو سپہ سالار قتلوشاہ اور تولائے خان فوجیں لے کر آگے بڑھے۔ امام ابن تیمیہؒ ان دونوں سے ملے اور ان کو حملے سے باز رکھا۔ ساتھ ہی آپ نے جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ ایک سال کے بعد تاتاریوں کا سیلاب پھر امڈ آیا۔ امام ابن تیمیہؒ مصر پہنچے اور اعیان سلطنت سے ملاقات کی انھیں جہاد کی ترغیب دی۔ بڑے بڑے آفیسران اور علماء امام ابن تیمیہؒ سے ملنے آئے۔ امام ابن تیمیہؒ اہل مصر کو دعوت جہاد دینے کے بعد دمشق واپس آئے اور مصر تشریف لے گئے اور سلطان ناصر، اعیان حکومت اور افسران فوج کو غیرت دلائی، جہاد کے لیے ابھارا اور مقابلہ کے لیے آمادہ کیا۔ آپ کی کوششوں سے سلطان ناصر فوجیں لے آیا۔ مرج الصفر (شقحب) نامی مقام پر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ تاتاری فوجیں برباد ہو گئیں۔ امام ابن تیمیہؒ اس معرکہ میں علامہ کے بجائے ایک بہادر سپاہی اور جنگ جو کی طرح عملاً جہاد میں شریک رہے۔

مخالفتیں تاریخ میں جن شخصیتوں نے کوئی بھی کارنامہ انجام دیا اور انقلاب برپا کیا ہے، جو ہستیاں فضل و کمال کی مالک گذری ہیں ان کی مخالفتیں بھی ضرور ہوئی ہیں۔ حسد اور بغض نے لوگوں کو مجبور کیا کہ ان کے فضل و کمال کا انکار کریں اور مخالفت میں چھچوری حرکتیں کر گذریں۔ جن لوگوں کے مفاد انقلابی کوششوں اور علمی تنقیدوں کی زد میں آتے ہیں ایسے تمام لوگ اور طبقے مصلحین کی دشمنی پر اتر آتے ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ حنبلی تھے۔ اشاعرہ کے رد میں اور حنابلہ کی تائید میں ۶۹۸ھ

میں انھوں نے دلائل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اسی روز سے ان کی مخالفت ہونے لگی۔ قاضی حنفی نے آپ کو فتویٰ دینے سے روک دیا۔ ۷۰۵ھ میں بڑے زور شور سے آپ کی مخالفت کا طوفان برپا ہوا حتیٰ کہ حکومت کی جانب سے مجلس مناظرہ کا اہتمام کیا گیا۔ امام ابن تیمیہؒ نے اپنی تصنیف "عقیدہ واسطیہ" سنائی۔ کئی دن کے بحث و مباحثہ کے نتیجہ میں سب نے تسلیم کیا کہ امام ابن تیمیہؒ عقائد اہل سنت کے مطابق ہیں۔ اس طرح بڑے بڑے علماء اور فاضلین نے آپ کی تائید کی اور آپ کی حق پرستی پر مہر تصدیق ثبت کردی لیکن ۷۱۸ھ میں تنگ نظر علماء نے آپ کو پھر قید کرا دیا۔

کردار سلطان ناصر تاجدار مصر امام ابن تیمیہؒ سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ جب دوبارہ تخت نشین ہوا تو ان علماء اور قاضیوں سے انتقام لینا چاہا جنھوں نے اس کے مخالفین کا ساتھ دیا تھا۔ یہی علماء اور قاضی امام ابن تیمیہؒ کو جیل میں ڈلوا چکے تھے اور امام موصوف ۱۸ ماہ مصر کی جیل میں قید و بند کی صعوبتیں بھگت چکے تھے۔ سلطان نے امام موصوف سے علماء اور قضاۃ کے متعلق فتویٰ پوچھا تو آپ نے صاف کہا ان کا خون سلطان پر حرام ہے اور ان کو کسی مصیبت میں مبتلا کرنا ہرگز ہرگز درست نہیں۔ سلطان نے کہا یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے آپ کو آلام میں مبتلا کیا تھا اور بار بار آپ کو قتل کرانے کی کوشش کی تھی۔

امام ابن تیمیہؒ نے جواب دیا جن لوگوں نے مجھے اذیتیں پہنچائی ہیں میں انھیں معاف کرچکا ہوں اور جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت پہنچائی ہے تو وہ خود انتقام لینے والا ہے۔ میں اپنے نفس کی جیت نہیں چاہتا۔ آپ نے نہ صرف خود ان لوگوں کو معاف کر دیا بلکہ سلطان کو بھی معاف کرنے پر آمادہ کرلیا چنانچہ

سلطان نے بھی ان کو معاف کر دیا حالانکہ ان لوگوں میں ابن مخلوف جیسے لوگ موجود تھے جو امام موصوف کے سر کے طالب رہ چکے تھے۔ چنانچہ ابن مخلوف بھی آپ کے اس بلند کردار کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ دمشق کا وزیر جیل میں آپ کی عیادت کے لیے آیا۔ امام موصوف کے پاس بیٹھتے ہی معذرت کرتے ہوئے کہا اگر کسی کوتاہی کی وجہ سے کوئی ملال آپ کے دل میں ہو تو معاف کر دیجیے۔ فرمایا میں نے تمہیں اور ان تمام لوگوں کو جنھوں نے مجھے اذیتیں پہنچائی تھیں معاف کر دیا ہے کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں حق پر تھا۔

کارنامے علّامہ امام ابن تیمیہؒ نے اپنی پوری زندگی تجدید و احیاء دین کے لیے وقف کر دی تھی۔ صاحبِ "تجدید و احیاء دین" کی صراحت کے مطابق آپ کے مندرجہ ذیل کارنامے ہیں۔

۱۔ یونانی منطق اور فلسفہ پر زبردست تنقید کی۔ اس کی کمزوریوں کی اس طرح نشاندہی کی کہ اس کا تسلط ڈھیلا ہو گیا۔ امام غزالیؒ کی طرح آپ کی تنقید کے اثرات بھی یورپ تک پہنچے چنانچہ یورپ میں ارسطو کی منطق اور یونانیت زدہ مسیحی فلسفیانہ نظام کے خلاف پہلی تنقیدی آواز امام ابن تیمیہؒ کے ڈھائی سو برس بعد اٹھ سکی۔

۲۔ انھوں نے اسلامی عقائد احکام اور قوانین کے حق میں زبردست دلائل فراہم کیے۔ اصطلاحی معقولات کی راہ چھوڑ کر کامن سنس Common Sense کی راہ اپنائی جو فطری اور قرآن و سنت کے مطابق تھی۔

۳۔ خالص سنت اور طریقہ سلف کی حمایت کی اور اس کی تائید میں ایسے دلائل فراہم کیے جو بے نظیر تھے۔

۴۔ تقلید جامد کے خلاف آواز اٹھائی اور ساتھ ہی عملاً اجتہاد کر کے

اس کی راہ پھر سے کھول دی ۔

۵۔ بدعات، مشرکانہ رسوم اور اعتقادی اور اخلاقی گمراہیوں کے خلاف سخت جہاد کیا اور اس سلسلے میں بڑی مصیبتیں جھیلیں اسلام کے چشمۂ صافی کو ہر قسم کی آمیزش سے پاک کیا۔

۶۔ خالص اسلام اور محض اتباع رسول کا اس بلند آہنگی سے صور پھونکا کہ آج تک اس کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے۔

۷۔ یہی نہیں کہ آپ نے زبان وقلم سے جہاد کیا ہو اور صرف اجتہاد سے کام لیا ہو بلکہ عملاً جہاد بالسیف کر کے ملت میں اجتہاد اور جہاد دونوں کی روح پھونکی۔

علاوہ ازیں علامہ محمد یوسف کوکن عمری ایم۔ اے کی کتاب "امام ابن تیمیہؒ" سے آپ کے مزید کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔

۸۔ اسلام کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں یعنی نصرانی اور تاتاریوں کا مقابلہ قلم اور تلوار دونوں سے کیا۔

۹۔ اسلامی علوم وفنون میں جمود طاری تھا۔ آپ نے ان سب کا جائزہ لیا اور ان میں تازگی پیدا کی، غیر اسلامی عناصر سے انھیں پاک کیا حتیٰ کہ باطل کی عظمت کا سکہ جو دلوں پر بیٹھ چکا تھا کافور ہو گیا۔

۱۰۔ مسلمانوں کی فکری گمراہیوں اور عملی بدعتوں پر بھرپور حملہ کیا اور ان کی اصلاح کا فکر، عمل اور اخلاق ہر پہلو سے بیڑا اٹھایا۔

وفات

امام ابن تیمیہؒ کو بڑھاپے میں دوبار جیل میں ڈالا گیا۔ یہ جیل بڑی سخت تھی۔ اس میں صرف جسمانی آزادی کو مفلوج نہیں کیا گیا تھا بلکہ کٹھ ملاؤں نے ان کے غور وفکر کی صلاحیتوں پر بھی جکڑ بندی کی کوشش کی تھی۔

امام صاحب سے جیل میں کتابیں کاغذ اور قلم چھین لیا گیا۔ آپ کوئلوں سے جیل کے در و دیوار پر قلبی واردات لکھتے رہے۔ جب یہ سامان بھی ختم ہوگیا تو رات دن قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہوگئے۔ آخر تلاوت ہی کرتے کرتے...
... اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ پڑھتے ہوئے اللہ کو پیارے ہوگئے۔

مولانا شبلی نعمانیؒ لکھتے ہیں ۷۱۸ھ میں تنگ نظر علماء نے آپ کو پھر قید کرا دیا اور قیدی کی حالت میں ۷۲۸ھ میں اجتہاد اور جہاد کا یہ پروانہ شمعِ حق پر قربان ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ (مقالات شبلیؒ)

شیخ احمد سرہندیؒ[۱]

امام ربّانی و مجدّد الف ثانی

سنہ ۹۷۱ھ تا سنہ ۱۰۳۴ھ
۱۵۶۴ء ۱۶۲۴ء

کابل کے کوہستانی سلسلہ میں ایک درّہ ہے جو درّہ فرخ شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ فرخ شاہ والی کابل کا نام سلطان شہاب الدین تھا۔ آپ نے کئی بار کفرستان ہند میں بسنے والے خدا کے باغیوں سے جہاد کیا۔ آخر میں آپ نے سلطنت اور جہانبانی ترک کر کے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کر لی تھی اور روحانیت میں سلوک کی منزلیں طے کر کے دلوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا۔ روحانیت کا تاج سر پر رکھ کر ایک دوسری ہی جہانبانی کا فریضہ انجام دینے میں مرتے دم تک مشغول اور منہمک رہے — یہی فرخ شاہ شیخ سرہندیؒ کے چودھویں جد ہیں یا یوں کہیے امام ربّانیؒ فرخ شاہ کی چودھویں پشت میں ہیں — شیخ سرہندیؒ کے پانچویں

---

[۱] اس مضمون کی بنیاد زیادہ تر پروفیسر مسعود احمد صاحب ایم۔اے حیدرآباد سندھ کے مقالہ شیخ احمد سرہندیؒ پر ہے جو معارف اعظم گڑھ اور الفرقان لکھنؤ کے فائلوں میں محفوظ ہے۔

جد شیخ رفیع الدینؒ حضرت جلال الدین بخاریؒ کے خلیفہ تھے اپنے مرشد کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے، یہ سلطان فیروز شاہ کا دور تھا۔ آپ نے سرہند کے قریب سرائس کے مقام پر قیام کیا۔ پھر دہلی تشریف لے گئے اور جب سلطان فیروز شاہ نے سرہند آباد کیا تو یہ خاندان وہاں منتقل ہو گیا۔ شیخ سرہندیؒ سرہند ہی میں پیدا ہوئے۔

تعلیم و تربیت

شیخ سرہندیؒ کا خاندان اہل تقویٰ اور اہل علم کا خاندان تھا۔ شیخ فرخ شاہ کے زمانے ہی سے علم و عمل، شریعت اور طریقت، ظاہر اور باطن، ہر پہلو سے آپ کے آباء و اجداد بزرگ ہوتے چلے آئے تھے۔ حضرت عمرؓ کی شان فاروقی اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا علم و تقویٰ اس فاروقی خاندان پر ہمیشہ ضوفگن رہا اور اپنی نورانی کرنوں سے اسے برابر منور کرتا رہا۔ خود آپ کے والد شیخ عبدالاحدؒ ان تمام پہلوؤں سے خاصہ اونچا مقام رکھتے تھے آپ نے ہوش سنبھالا تو اپنی والدہ اور والد کو تقویٰ اور پرہیز گاری کی روش پر گامزن پایا۔ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت دونوں میں تقویٰ کی مٹھاس اور پرہیز گاری کی چاشنی شامل تھی۔ آپ سانس بھی لیتے تو حسن عمل اور حسن سیرت کی خوشبو سے آپ کا دماغ معطر ہو جاتا۔ حسن فکر اور حسنِ نیت کی مہک سے آپ کا ذہن و مزاج مہکنے لگتا۔ اس ماحول میں جب ذرا ہوشیار ہوئے تو اپنے والد ہی سے پڑھنا لکھنا شروع کیا۔ قرآن بچپن ہی میں حفظ کر لیا۔ علوم معقول اور منقول دونوں میں کمال پیدا کرنے کی طرف توجہ رہی۔ اپنے والد کے علاوہ دوسرے ماہرین علوم و فنون سے بھی استفادہ کیا۔ حدیث کی سند شیخ یعقوب کشمیریؒ سے حاصل کی۔ اپنے دور کے مشہور اور مقدس عالم قاضی بہلول بدخشانیؒ سے خاصا استفادہ کیا۔ ذہانت اور فطانت سے تو اللہ نے

نوازا ہی تھا، محنت و مشقت اور شوق و ذوق سے علم حاصل کرنے کی بھی اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی۔ چنانچہ آپ علم کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ تقویٰ اور طہارت اور حسن عمل کے پہلو سے بھی آپ نے اونچا مقام حاصل کر لیا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا آپ ہر پہلو سے ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے حتیٰ کہ آپ خود ایک بڑے عالم اور شیخ وقت ہو گئے اور پھر بعد کے کارناموں نے آپ کو امام ربّانی اور مجدّد الف ثانی بنا دیا۔

درس و تدریس علم کے پھولوں سے دامن بھر لینے کے بعد آپ اکبر آباد تشریف لے گئے۔ جلال الدین اکبر کا دور تھا، اکبر آباد دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ابوالفضل اور فیضی کا دور دورہ تھا فیضی تفسیر بے نقط لکھنے میں مصروف تھا۔ شیخ سرہندیؒ اکبر آباد میں درس و تدریس میں منہمک ہو گئے۔ ابوالفضل اور فیضی سے بھی آپ کے مراسم تھے فیضی اپنی تفسیر کے سلسلہ میں آپ سے کبھی کبھی مشورہ بھی لیتا تھا۔ شیخ سرہندیؒ کے حلقۂ درس میں بڑے بڑے فاضل شریک ہوتے تھے۔ ایک عرصہ تک آپ درس و تدریس میں منہمک رہے۔ لیکن آپ کے والد کی خواہش تھی کہ آپ اکبر آباد کے بجائے سرہند ہی میں اقامت فرمائیں۔ چنانچہ آپ کے والد شیخ عبدالاحدؒ خود اکبر آباد تشریف لائے اور آپ کو اپنے ہمراہ لے کر سرہند کے لیے روانہ ہوئے۔ جب تھانیسر پہنچے تو وہاں کے ایک رئیس جو اکبر بادشاہ کے مقربین میں تھے، شیخ سلطان نام تھا، انھوں نے شیخ سرہندیؒ سے اپنی صاحبزادی منسوب کرنے کی پیش کش کی جسے آپ نے قبول فرما لیا اور نکاح ہو گیا۔ آپ اپنی اہلیہ کو لے کر اپنے والد کے ہمراہ سرہند تشریف لے آئے اور اپنے والد سے باطنی فیض حاصل کرنے میں لگ گئے۔

فیض باطنی شیخ سرہندیؒ نے ابتدا ہی سے اپنے والد بزرگوار سے روحانی فیض حاصل کیا۔ حتیٰ کہ آپ کے والد نے آپ کو چشتیہ سلسلہ کی خلافت سے سرفراز فرمایا۔ شیخ کمال کیھتلیؒ نے آپ کو لڑکپن ہی میں خاص توجہ سے نوازا تھا اور قادری نسبت سے سرفراز کیا تھا۔ نقش بندی فرقۂ خلافت آپ کو خواجہ محمد باقی باللہؒ نے عطا فرمایا تھا۔ یہ تینوں نسبتیں شیخ سرہندیؒ میں جمع تھیں، لیکن آپ کو سلسلۂ نقش بندیہ سے خاص لگاؤ تھا۔ خواجہ محمد باقی باللہؒ سے اکتساب فیض کے سلسلہ میں شیخ سرہندیؒ نے خود اپنے خلیفہ خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ سے فرمایا۔

جس روز سے میں نے اپنے حضرتؒ سے تعلیم طریقت شروع کی اسی روز سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ عنقریب اللہ تعالیٰ محض اپنے کرم سے مجھے اس راہ کی معراجِ کمال تک پہنچا دے گا لیکن اپنے احوال و اعمال پر نظر جاتی تو یقین نہ آتا مگر چین نہیں پڑتا۔ اکثر گنگنا تا رہتا۔

ازیں نورے کہ از تو بر دلم تافت
یقیں دانم کہ آخر خواہمت یافت

شیخ سرہندیؒ نے خواجہ باقی باللہؒ کے صاحبزادگان خواجہ عبیداللہؒ اور خواجہ عبداللہؒ کو لکھا تھا۔

"میں سراپا آپ کے والد رحمۃ اللہ علیہ کے احسانوں میں غرق ہوں اس راہ میں الف بے کا سبق بھی انھیں سے لیا ہے اور حروف تہجی بھی اس راہ کے انھیں سے سیکھے ہیں۔ ان کی توجہ نے ڈھائی ماہ میں اس نا قابل کو نقش بندی نسبت تک پہنچا دیا۔ اس قلیل مدت میں جو تجلیات، ظہورات، انوار، الوان اور بے رنگیاں اور بے کیفیاں حاصل ہوئیں، ان کی شرح اور تفصیل کیا بیان کروں؟"

خود خواجہ محمد باقی باللہؒ کو شیخ سرہندیؒ نے متاثر کیا تھا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔

"شیخ احمد سرہند کے ایک مرد ہیں۔ علم کثیر، عمل قوی رکھتے ہیں۔ میں چند روز ان کے ساتھ رہا ہوں۔ ان کے ساتھ نشست و برخاست اختیار کی ہے۔ میں نے بہت سی عجیب باتیں مشاہدہ کی ہیں، معلوم ہوتا ہے وہ آگے چل کر ایک چراغ بننے والے ہیں جس سے دنیا روشن ہوگی۔

جس مرید اور سالک کے متعلق خود شیخ کے یہ تاثرات ہوں اس کی عظمت کا اندازہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔

اکبری فتنہ

شیخ سرہندیؒ کی عظمت اور کارناموں کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا اور آپ کے کار تجدید کی اہمیت اچھی طرح واضح نہیں ہو سکتی جب تک اس دور کے عظیم فتنہ کا ہلکا سا عکس ہمارے سامنے نہیں آجاتا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، ملاّ عبدالقادر صاحبِ منتخب التواریخ اور عبداللہ ازبک، اکبر کو مدعیٔ نبوت شمار کرتے ہیں اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ جب دین الٰہی اکبر شاہی تصنیف کیا گیا تو اس کے لیے نبوت پہلے درکار تھی جو ظاہر ہے اکبر کے علاوہ کسی اور کے لیے موزوں نہیں ہو سکتی تھی۔ اور پھر یہ کہنا بھی ایک لطیفہ[1] سے زیادہ کہ دین الٰہی پر ایمان لانے والے صرف ۱۸ تھے اور وہ صرف دربار تک محدود رہا اور اکبر کے مرتے ہی اس کا دین بھی دم توڑ گیا اور اپنی موت آپ مر گیا کیونکہ النّاسُ علیٰ دِینِ مُلُوکِہِم"،

---

[1] البتہ یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ضابطہ میں صرف چند ہی افراد ایمان لائے ہوں ترکِ اسلام کا اعلان تو شاید ایک نے بھی نہیں کیا ہو۔

لوگ اپنے حکام اور بادشاہوں کے طور طریق اختیار کرتے ہیں. ان کے افکار و خیالات اپناتے ہیں، ان کے رنگ میں اپنی زندگیاں رنگ لیتے ہیں یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر صرف اکبر اور اس کے دین الٰہی کے سلسلہ میں یہ حقیقت کس طرح بدل جائے گی جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر کا سپوت دارا شکوہ چوتھی پیڑھی میں ہوتے ہوئے بھی اسی کے دین کے احیاء کی کوشش کرتا ہے. حتیٰ کہ اسی کی خاطر قربان بھی ہو جاتا ہے! اور جب کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نہ صرف اس زمانہ ہی کے کفار و مشرکین اور غیر مسلم اکبر اور اس کے دربار کو پسند کرتے تھے بلکہ آج کے بھی تمام اینٹی اسلام لوگ اسے پسند کرتے ہیں اور اسی پسندیدگی نے اس ملحد اعظم کو اکبر اعظم یا مغل اعظم کا لقب عطا کیا ہے حالانکہ عالمگیر کی طرف جو یہ قول منسوب ہے کہ جد اکبر، اکبر نہ بود بلکہ اکفر بود ایک حقیقت ہے تو اس اکفر اعظم کے اثرات اتنے خفیف کس طرح ہو سکتے ہیں کہ اس کے مرتے ہی ہوا میں اڑ گئے ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج کا فتنہ وحدتِ ادیان بھی اکبر کے دین الٰہی کی ہی صدائے بازگشت ہے. بہر حال اس فتنہ کا اثر یہ تھا کہ کتنے ہی علماء سوء تھے جنھوں نے صاحب جبہ و دستار ہونے کے باوجود داڑھیاں منڈوائیں اور شرابیں پی تھیں اور اس سے پہلے ایسے ہی دین فروشوں اور عقبیٰ فراموشوں نے دین الٰہی اکبر شاہی کا تانا بانا تیار کیا تھا اور اکبر کا مزاج بھی بے دینی اور الحاد کے لیے انھیں نے تیار کیا تھا۔ انھیں علماء سوء ابو الفضل وغیرہ کی نگرانی میں محل کے اندر عبادت کے لیے آتش کدہ تیار ہوا، ناقوس، صور اور اکبر کی تفریحیں اکبر کا وظیفہ بن گئیں، راجاؤں کی لڑکیوں کو تصرف میں لانے کی وجہ سے ان کا اثر اکبر کے مزاج پر غالب آ گیا تھا۔ برہما، مہادیو، بشن، کشن اور مہامائی وغیرہ کی تعظیم کی جاتی تھی۔ محل میں سورج کی

پوجا چار مرتبہ ہوتی تھی۔ سورج کے ایک ہزار ناموں کی مالا جپی جاتی تھی قشقہ لگایا جاتا تھا۔ آگ، پانی، درخت وغیرہ تمام مظاہر قدرت حتیٰ کہ گائے اور اس کے گوبر کی پوجا خود اکبر کرتا تھا۔ خنزیر کو (معاذ اللہ) مظہر خدا سمجھا جانے لگا۔ گائے کا گوشت حرام، خنزیر اور شیر کا گوشت مباح شمار کیا جانے لگا۔ سود، شراب، اور جوا حلال سمجھا گیا۔ شراب فروشوں کی نسل سے ایک عورت کے زیر اہتمام سرکاری شراب خانہ کھولا گیا۔ داڑھی کی دُرگت بنائی گئی۔ درباریوں نے بڑے اہتمام سے داڑھیاں منڈوائیں، جوان عورتوں کو منہ کھول کر چلنے کا حکم دیا گیا۔ بدکاری کے اڈے قائم کیے گئے۔ ختنہ کرانے کی عمر بارہ سال مقرر کی گئی۔ مردے کو پانی میں ڈالنے، جلانے یا درخت سے باندھ دینے کا حکم دیا گیا۔ مردے کے پاؤں قبلہ رُخ کرنے کا حکم بھی دیا گیا۔ خود اکبر قبلہ کی طرف پاؤں کر کے سوتا تھا۔ خود کو سجدہ کراتا تھا۔ اسلام کی ضد میں خنزیر اور کتے کی پاکی کا حکم دیا گیا۔ شاہی محل کے نیچے یہ دونوں جانور زیارت کے لیے رکھے گئے۔ ان کا دیکھنا بھی عبادت شمار کیا گیا۔ تناسخ کو صحیح سمجھا جانے لگا۔ عربی پڑھنا عیب قرار دیا گیا۔ ابوالفضل کے سامنے اسلاف کا قول پیش کیا جاتا تو کہتا تم فلاں حلوائی، فلاں جفت ساز اور فلاں موچی کا قول پیش کرتے ہو۔ صحابۂ کرام کو طرح طرح مطعون کیا جانے لگا۔ قرآن کو مخلوق اور وحی کو محال کہا جانے لگا۔ معراج اور شق القمر کو غلط قرار دیا گیا۔ احمد، محمد اور مصطفیٰ جیسے نام بدلے جانے لگے۔ ہندو مزاج نام کے مسلمان حضورؐ کی نبوت کے منکر بن گئے اور عیسائیوں نے حضورؐ پر ناپاک اور گندے الزام لگائے مگر اکبر کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ یہ خباثتیں اس قدر بڑھیں کہ چند برس ہی اسلام مغلوب ہو گیا اور کفر و الحاد اور شرک و ضلالت کو غلبہ

حاصل ہوگیا۔ نہ معلوم کتنی مسجدوں میں ہندوؤں کے فراش خانے اور چوکی خانے بن گئے۔ خود سوچئے! یہ گندگیاں جو جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھیں، اور حکومت کی سرپرستی میں بلکہ اس کے اہتمام میں پروان چڑھی تھیں، اکبر کے مرتے ہی کس طرح ایک دم کافور ہو سکتی ہیں۔ جہانگیر کے عہد میں بھی یہ گمراہیاں باقی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ آب وتاب اور وہ شباب جو اکبر کی زندگی میں تھا اب ڈھل چکا تھا۔ لیکن جس گمراہی کی جڑیں سیاست اور حکومت کے ایوانوں سے معاشرت کی وادیوں تک پھیل چکی ہوں اور آبادیوں کے گلی کوچوں تک میں پہنچ چکی ہوں اور خواص سے منتقل ہو کر عوام تک جا پہنچی ہوں وہ آخر اپنے آپ کس طرح کٹ جاتیں، خود بخود کس طرح خشک ہو جاتیں۔ ان کے کھودنے کے لیے تو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ جیسے بزرگوں اور مجدد الف ثانیؒ جیسے بزرگوں کی ضرورت تھی بلکہ ایک باقاعدہ اور مستقل تحریک کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مجدد صاحب نے یہ تحریک چلائی۔ بقول ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے یہ طریقہ اصلاح اختیار کیا کہ رفتہ رفتہ خان خاناں، صدر جہاں، خان اعظم، مہابت خاں، تربیت خاں، اسلام خاں، دریا خاں، سکندر خاں، مرتضیٰ خاں وغیرہ امراء کو اپنے حلقۂ عقیدت وارادت میں داخل کر کے بادشاہ کی توجہ دین کی طرف مبذول کرانے کی کوششیں کیں۔ بالآخر جہانگیر نہ صرف معتقد ہوا بلکہ اپنے بیٹے خرم (شاہجہاں) کو حضرت علیہ الرحمۃ کے سلسلہ میں وابستہ کرایا۔ سجدۂ تعظیمی موقوف ہوا۔ گائے کا ذبیحہ پھر شروع ہوا۔ جو مسجدیں گرا دی گئی تھیں، دوبارہ تعمیر ہوئیں۔ اور جس قدر خلاف شرع قوانین رائج ہو گئے تھے وہ سب منسوخ ہوئے۔ فن مصوری جو عہد جہانگیری میں بام عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ وہ فن تعمیر اور فن خطاطی کی طرف منتقل ہوا اور شجر طیبہ کی اصلِ ثابت

کی وجہ سے شاہجہاں کے علاوہ اورنگ زیب بھی حضرت علیہ الرحمۃ کے خاندان کا تربیت یافتہ ہوا اور اس کے عہد میں فقہ کی سب سے بڑی کتاب فتاوٰی عالمگیری مرتب ہوئی۔ دربار میں علماء اور فضلاء کو جگہ ملی اور مجدد صاحب کے شاگردوں ہی کے سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت مظہر جانِ جاناں، شاہ غلام علی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا خالد رومی، صاحبِ فتاوٰی شامی، شاہ عبد الغنی مجددی وغیرہ پیدا ہوئے۔ دبنیات کراچی صفر ۱۳۸۴ھ)

کارنامے شیخ سرہندی کی زندگی سرتا سر کارناموں سے پُر ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ نہیں ہے جس کی اصلاح کا بیڑا آپ نے نہ اٹھایا ہو۔ اکبری فتنہ کا میل کچیل جس قدر تھا اسی قدر نور ہدایت کا صابون آپ نے استعمال کیا۔ ضلالت کی آندھی جس قدر زور شور سے چلی تھی آپ نے بھی اشاعتِ دین اور احیاءِ دین کی جوابی تحریک اسی قدر زور شور سے چلائی۔ باطل کا سیلاب جس طرح امڈا تھا حق کا سیلاب بھی اسی طرح آیا۔ غرض کہ آپ کے کارنامے بہت ہیں۔ مثلاً:

۱۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہی ہے کہ آپ نے اکبر کے الحادی فتنہ کی جڑیں کھودنے کی فکر کی جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیابی سے سرفراز فرمایا۔

۲۔ آپ نے احیاءِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی جدوجہد مطلق العنان شاہی حکومت کے مقابلے میں کی اور یکہ تنہا یہ کام انجام دیا۔

۳۔ حکومت کو بالکل کفر کی گود میں جانے سے بچا لیا۔

۴۔ تصوف کے چشمۂ صافی میں جو غیر اسلامی فلسفہ اور عناصر گھس آئے تھے اور جو راہبانہ گمراہیاں اس میں شامل ہوگئی تھیں، ان تمام آلائشوں سے

اسے پاک کیا اور کمال یہ ہے کہ یہ کارنامہ تصوف ہی کے ذریعہ انجام دیا۔

۵۔ ان تمام رسموں کی سخت مخالفت کی جو جاہلیت پر مبنی تھیں۔

۶۔ ان تمام بدعات کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی جن کی جڑوں نے سنّتِ نبویؐ کے تناور درخت کو جکڑ لیا تھا اور عوام و خواص سب کی زندگیاں جن بدعتوں سے گدلی ہو رہی تھیں ان سے زندگیوں کو پاک و صاف کرنے کی کوشش فرمائی۔

۷۔ بیعت و ارشاد کے ذریعہ اتباعِ شریعت کی ایسی عظیم الشان تحریک چلائی کہ صرف ہندوستان ہی کے گوشے گوشے میں نہیں بلکہ وسط ایشیا تک آپ کے خلفاء پہنچے اور انھوں نے ہر جگہ عقائد اور اخلاق کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔

۸۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ اور براہِ راست آپ ہی کی تجدیدی تحریک کا اثر تھا کہ جلال الدین اکبر جیسے اکفر اعظم کی اولاد سے حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسا عظیم حکمراں اٹھا جو صرف حکمراں ہی نہ تھا بلکہ ایک عظیم مصلح اور محی سنت بھی تھا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

محی الدّین اورنگ زیب عالمگیرؒ

ایک عظیم مصلح

۱۰۱۷ھ / ۱۶۱۸ء تا ۱۱۰۸ھ / ۱۷۰۷ء

اورنگ زیبؒ شاہجہاں کا بیٹا، جہانگیر کا پوتا اور جلال الدین اکبر کا پرپوتا تھا۔ وہ ہندوستان کے مشہور حکمراں خاندان، خاندانِ مغلیہ کا چھٹا عظیم حکمراں تھا۔ اس کا پچاس سالہ دورِ حکمرانی، سلطنت کی وسعت، امن وامان، رفاہیت وخوش حالی اور وحدت وغیرہ ہر لحاظ سے فائق دور تھا اور تجدید واحیاءِ دین کے پہلو سے فائق تر بلکہ فائق ترین دور تھا۔ بقول الگزنڈر ہملٹن، اس کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت کا مقابلہ یورپ کے ممالک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے دور میں دہلی کی حکومت غزنی سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک تک وسیع تھی۔ بقول سرجادوناتھ سرکار، ابتدائے عہد تاریخ سے لے کر قیام حکومت برٹش تک اس کی حکومت سب سے بڑی حکومت تھی۔ لیکن ہمیں اس کی حکمرانی سے زیادہ اس کی احیاءِ سنت اور تجدید دین کے سلسلہ میں کوششوں اور کارناموں سے دلچسپی ہے۔

تعارف اورنگ زیب عالمگیرؒ ۱۶۱۸ء میں ممتاز محل کے بطن سے

پیدا ہوا وہ غیر معمولی ذہین، محنتی اور جفاکش تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کا بہترین اور معقول انتظام ہوا۔ وہ بہت جلد علوم و فنون کا ماہر ہو گیا۔ اس نے اپنی نوعمری ہی میں غیر معمولی سوجھ بوجھ، عزم و ثبات، حوصلہ، شجاعت اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس نے ۱۴ سال کی عمر میں ہاتھی سے مقابلہ کیا۔ وہ ابھی ۱۸ ہی برس کا تھا کہ دکن کی صوبہ داری کا بھاری بوجھ اس کے کاندھوں پر ڈالا گیا اور باہمت شہزادہ نے اسے خوشی خوشی اٹھا لیا۔ حالانکہ دکن کا انتظام جان جوکھوں کا کام تھا۔ اورنگ زیبؒ نے جان توڑ کوشش کر کے بہت جلد حالات کو قابو میں کر لیا۔ اور چند ہی برس میں دکن کا معقول انتظام ہو گیا۔ بلخ اور بدخشاں کی مہمات جہاں مراد اور شجاع دونوں ناکام رہے تھے اورنگ زیبؒ کو جب ان مہمات پر روانہ کیا گیا تو وہ خوشی خوشی روانہ ہو گیا اور متعدد معرکے سر کیے اور انھیں معرکوں میں وہ حیرت انگیز منظر سامنے آیا جس سے اورنگ زیبؒ کے جذبۂ دینی اور روحانی قوۃ کا اندازہ ہوتا ہے۔ گھمسان کی جنگ جاری تھی کہ ظہر کا وقت ہو گیا۔ نماز مؤخر کرنے کا مشورہ دیا گیا لیکن اورنگ زیب نہیں مانا۔ فوراً سواری سے اترا اور عین میدان جنگ میں نماز کی نیت باندھ لی اور نہایت اطمینان سے نماز ادا کی۔ والئ بلخ اورنگ زیبؒ کے اس جذبۂ ایمانی سے بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے جنگ بند کر کے صلح کر لی۔

اورنگ زیب کے دکن سے ہٹنے کے بعد حالات پھر بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ آٹھ نو سال کے عرصہ میں کئی صوبے دار مقرر ہوئے مگر ابتری میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ آخر ۱۶۵۳ء میں پھر اورنگ زیبؒ کو دکن کا والی مقرر کیا گیا اور اس نے پھر اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر حالات کو بہت کچھ سدھار لیا۔

لیکن اورنگ زیب کی تدابیر، اصلاحات اور حالات سدھارنے کی ہر جدوجہد میں بار بار اس کے بھائی اور خود شاہجہاں آڑے آتا تھا! اور وہ ایسے تمام مواقع پر خود خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ آخر اس نے دین و ملّت و سلطنت اور رعایا کی بھلائی کی خاطر شاہجہاں کو قید کرکے سلطنت کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینا ضروری خیال کیا۔ چنانچہ اس نے طاقت کے ذریعہ سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اپنے بعد کے کردار سے اپنی اصلاحی کوششوں سے اپنے تجدیدی کارناموں سے اپنی سادہ زندگی سے اور اپنی بلند سیرت سے ثابت کر دیا کہ اس کا حکومت پر قبضہ، حکمرانی کے ٹھاٹھ باٹھ کی خاطر نہ تھا بلکہ خدا اور خلق کی طرف سے جو فرائض اور ذمہ داریاں اس پر عائد ہوتی ہیں، ان کی خاطر اس نے ایسا کیا تھا۔

سیرت و کردار

اورنگ زیبؒ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا اور اللہ تعالیٰ کا کرم و فضل آخر عمر تک اس کے شامل حال رہا۔ چنانچہ آخر تک اس کی ذہنی اور جسمانی توانائی برقرار رہی۔ عالمگیرؒ غیر معمولی محنت اور مشقت کا عادی تھا۔ رات کو کم سوتا تھا۔ اپنا وقت بالکل ضائع نہیں ہونے دیتا تھا۔ نہایت ہی پاکیزہ زندگی گذارتا تھا۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ، تصنع اور تکلّفات سے تو اسے گویا بیر تھا۔ اس کی زندگی سپاہیانہ اور مجاہدانہ تھی۔ وہ بیت المال کو خدا اور خلق کی امانت سمجھتا تھا۔ صرف بیت المال ہی کو نہیں اپنی تمام صلاحیتوں اور حکومت کے جملہ ذرائع و وسائل اور اختیارات سب ہی کو خدا اور خلق کی امانت تصور کرتا تھا، ٹوپیاں سی کر اور قرآن مجید لکھ کر اپنے لیے روزی حاصل کرتا تھا، اس کی مجلس سنجیدہ اور اس کا دربار لہو و لعب سے پاک تھا، وہ ایک عظیم حکمراں ہی نہ تھا بلکہ جید عالم اور حافظ قرآن بھی تھا! اس نے ۴۵ سال کی عمر یعنی ۱۰۶۲ھ میں حفظ کرنا شروع کیا "سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ" سے یہ تاریخ نکلتی ہے اور ۱۰۶۳ھ میں پورا قرآن حفظ کر لیا۔ "لوح محفوظ" سے

یہ تاریخ نکلتی ہے۔ وہ کئی زبانوں کا رمز شناس، فارسی کا ادیب اور خوشنویس بھی تھا۔ قرآن و سنت اور فقہ پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ فرائض و واجبات کے علاوہ وہ نوافل کا بھی پابند تھا۔ شب بیداری، تہجد گذاری اور آہ صبح گاہی اس کا معمول تھا۔ ایام بیض، دوشنبہ، جمعرات اور جمعہ کو روزہ رکھتا تھا۔ اعتکاف کا بھی عادی تھا۔ شرعی احکام کے نفاذ میں کسی مصلحت کو روا نہ رکھتا تھا۔ احساس ذمہ داری کا مالک تھا۔ چنانچہ امور سلطنت پر خود نظر رکھتا تھا۔ گورنروں اور سپہ سالاروں پر نگاہ رکھتا تھا۔ ڈاک بھی خود ہی دیکھتا تھا۔ عدل وانصاف اور دادرسی میں امیر و غریب اور ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہ کرتا تھا۔ اس نے شہزادوں اور خود حکومت کے خلاف استغاثہ دائر کرنے کی آسانیاں بہم پہنچائی تھیں۔ انصاف پر کسی فیس اور معاوضہ لینے کو ناروا خیال کرتا تھا۔ اس کی حکومت میں انصاف مفت ملتا تھا۔ عفو و درگذر کی خوبی سے بھی وہ مالا مال تھا۔ معافی مانگنے پر مخالفوں اور دشمنوں کو بھی معاف کر دیتا تھا۔ چنانچہ جسونت سنگھ، شیواجی اور انگریز تاجروں کے ساتھ اس نے بار بار عفو و درگذر سے کام لیا۔ اورنگ زیب علم دوست اور کمالات پسند تھا چنانچہ علماء اور اہل کمال کی بڑی عزت و توقیر کرتا تھا اس کے دور میں تعلیم عام تھی۔ عہد عالمگیری میں علوم و فنون اور صنعت و حرفت کو خوب خوب فروغ حاصل ہوا۔

اعلیٰ کردار کا سبب

عالمگیرؒ کے اس اعلیٰ اخلاق، بلند سیرت اور بہترین کردار کا سبب اس کے اتالیق اور اساتذہ ہیں جو خود بے داغ سیرت، اعلیٰ اخلاق اور بے نظیر کردار کے مالک تھے۔ مشیت ایزدی، فضل باری اور رحمت خداوندی کے علاوہ، شاہجہاں کا وہ دینی رخ بھی عالمگیرؒ کی تعلیم و تربیت میں کارفرما رہا ہے جو شیخ احمد سرہندیؒ کی کوششوں سے اس میں

پیدا اور نمایاں ہوا تھا۔ شیخ احمد ٹھٹھوی رح جیسے اساتذہ نے عالمگیر کو کندن بنا دیا۔ شیخ احمد سرہندی رح کے صاحبزادگان شیخ محمد سعید رح اور خواجہ محمد معصوم اور ان کے خلفاء وغیرہ نقشبندی بزرگوں سے اورنگ زیب بہت متاثر تھا اور برابر ان حضرات سے فیض حاصل کرتا رہتا تھا۔ وہ دہلی سے لاہور جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے سرہند میں خواجہ محمد معصوم اور خاندان مجدد الف ثانی رح کے دیگر بزرگوں سے ملاقات کرنا ضروری خیال کرتا تھا۔ اورنگ زیب رح نے خواجہ محمد معصوم رح سے کئی بار استدعا کی کہ وہ سفر اور حضر میں اس کے ساتھ رہا کریں لیکن انھوں نے اپنی جگہ اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین رح کو دہلی بھیج دیا۔ اورنگ زیب رح ان سے فیض حاصل کرتا رہا اور مدارج سلوک طے کرتا تھا خواجہ محمد معصوم رح کے جانشین خواجہ محمد نقشبندی رح کی بھی اورنگ زیب رح کے دل میں بڑی عزت تھی، اور دونوں میں باہمی تعلقات بھی خاصے تھے۔ اورنگ زیب رح کی شہزادگی کے زمانے میں اس کے ساتھ خواجہ محمد معصوم رح کے صاحبزادے شیخ محمد اشرف اور بھتیجے شیخ سعد الدین رح بھی دکن میں مقیم تھے۔ اور جب اورنگ زیب رح دارا شکوہ کے مقابلہ پر نکلا تو شیخ محمد اشرف رح اس کی فوج میں موجود تھے۔ شیخ سعد الدین رح نے بادشاہ کے ساتھ رہ کر شریعت کو رواج دینے اور سنّت کو زندہ کرنے کے سلسلہ میں بڑا کام کیا۔ اورنگ زیب رح کی تخت نشینی کے بعد خواجہ محمد معصوم رح اور ان کے بڑے بھائی شیخ محمد سعید رح دربار میں تشریف لائے۔ اورنگ زیب رح نے ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ غرض کہ خاندان مجددیہ سے عالمگیر رح کو ہمیشہ بڑا تعلق رہا۔ اس خاندان کے بزرگوں کی صحبت سے اسے بڑا فائدہ پہنچا۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد اسلم تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ خاندانِ مجدد رح ہی تھا جس نے اورنگ زیب رح کو محی الدین بنا دیا"

پھر آگے لکھتے ہیں "اورنگ زیبؒ اپنے عنفوان شباب ہی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے متاثر ہو چکا تھا اور اس نے ان کے جانشین خواجہ محمد معصومؒ کے ساتھ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ زمانہ شہزادگی میں اس کی خط و کتابت اکثر خواجہ صاحب سے رہتی تھی۔ خواجہ صاحب کے مکتوبات میں ایسے مکاتیب موجود ہیں جو شہزادہ دین پناہ کے نام لکھے گئے ہیں۔ جب خواجہ صاحب حج بیت اللہ کے ارادہ سے سورت روانہ ہوئے تو اورنگ زیب ان دنوں دکن میں مقیم تھا۔ اس نے اس موقعہ پر آپ کی ملاقات کو غنیمت جانا اور نربدا پار کر کے آپ سے ملنے آیا اور آپ کی دعائیں لیں۔ مفتی غلام سرور لاہوری کی روایت کے مطابق آپ نے مدینہ منورہ میں اورنگ زیبؒ کے لیے دعا کی تھی۔ شہزادہ دین پناہ کے نام ایک مکتوب میں خواجہ صاحب اسے جہاد شروع کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں ایک گھڑی کا جہاد حرم مکہ میں حجر اسود کے پاس لیلۃ القدر میں قیام سے افضل ہے۔ جب اورنگ زیب برہان پور سے فوج لے کر نکلا تو خواجہ صاحب نے اسے ایک خط ارسال کیا جس میں اسے دارالحکومت پر فوج کشی پر تحسین پیش کی۔ اسی مکتوب میں آپ اسے ایک حدیث یاد دلاتے ہیں جس میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو اجر عظیم کی بشارت دی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم صاحب آخر میں لکھتے ہیں۔ اورنگ زیبؒ کی تعلیم و تربیت اسی دور کے بڑے جید اور دیندار علماء کی نگرانی میں ہوئی تھی جو سب کے سب اپنے علم و تقویٰ کی بناء پر عوام میں بے حد مقبول تھے اور فطری طور پر انھوں نے دارا شکوہ جیسے رئیس ملاحدہ، ملحد نامقبول اور ملحد نکوسیدہ افعال کے خلاف اورنگ زیبؒ کا ساتھ دیا تھا۔

غرض کہ اورنگ زیبؒ کی اعلیٰ سیرت اور بلند کردار کا سبب اس کی تعلیم و تربیت اور علماء مشایخ کا فیض صحبت تھا۔

کارنامے مولانا شبلیؒ کی تحقیق کے مطابق عالمگیرؒ نے مندرجہ ذیل اصلاحات اور کارنامے انجام دیے۔

۱۔ سابق سلاطین کے دور میں مالگذاری کے علاوہ بیسیوں ٹیکس اور محصول ایسے تھے جن کی اجازت اسلام نہیں دیتا۔ اورنگ زیبؒ نے انھیں یک قلم منسوخ کر دیا۔ حالانکہ ان کی آمدنی، مالگذاری کے برابر تھی اور ان کی تعداد اسّی تک پہنچتی تھی۔

۲۔ ایک دستور یہ چلا آتا تھا کہ جب کوئی عہدہ دار فوت ہوتا تو اس کی جائداد اور اسباب بحق سرکار ضبط کر لیا جاتا تھا۔ اورنگ زیبؒ نے اس ظالمانہ دستور کو ختم کر دیا۔

۳۔ سلطان اورنگ زیبؒ نے ۱۰۸۲ھ میں ایک فرمان جاری کیا کہ تمام اضلاع میں منادی کرا دی جائے کہ جس کسی کو سلطان پر کوئی دعویٰ ہو عدالت میں دائر کرے اور سرکاری وکیل اس کی جواب دہی کریں، اگر اس کا حق ثابت ہو جائے تو اس کا مطالبہ ادا کر دیا جائے۔

۴۔ سلطان اورنگ زیبؒ نے انتہائی محتاط پرچہ نویسوں کا وسیع نظم قائم کیا! اگرچہ یہ نظم پہلے ہی سے قائم تھا مگر سلطان نے اس کو وسعت دی اور انتہائی احتیاط سے پرچہ نویسوں کی اطلاعات پر کارروائی انجام دینے کا اہتمام کیا چنانچہ سلطان اپنی وسیع وعریض سلطنت کی رعایا سے باخبر رہتا اور دادرسی کرتا تھا۔ واقعات عالمگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادوں، صوبہ داروں، عاملوں وغیرہ کی ایک ایک فرو گذاشت کی گرفت کرتا تھا۔ ہزاروں کوس پر اگر کسی راہ چلتے سوداگر کی کوئی چیز ضائع ہو جاتی تھی اس کی بھی سلطان کو خبر ہو جاتی تھی اور وہاں کے عامل سے باز پرس کرتا تھا۔

۵۔ شاہی حکومتوں میں تقریباً سب ہی جگہ یہ دستور رہا ہے کہ سالانہ جشن کے موقع پر بادشاہ کو نذریں گذاری جاتی تھیں، جو کبھی کبھی عہدہ دار کی سالانہ تنخواہ کے برابر ہوتی تھیں۔ لہٰذا عہدہ داران حکومت رشوتوں اور ناجائز آمدنیوں سے اپنا پیٹ بلکہ تجوریاں بھرتے تھے اور آئندہ نذر گذارنے کے لیے دورانِ سال عوام کو خوب لوٹتے تھے اور ان کا خون چوستے تھے۔ عالمگیرؒ نے ۱۰۸۰ھ میں مفاسد کے اس دروازے کو بالکل بند کر دیا۔

۶۔ عدل و انصاف میں اس قدر اہتمام کیا کہ قرنِ اول کی اسلامی حکومت کی یاد تازہ ہو گئی۔ مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں۔ وہ دن میں دو تین دفعہ دربار عام کرتا تھا اور مطلق کسی کی روک ٹوک نہ تھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ جو چاہتا تھا کہتا تھا اور عالمگیر نہایت توجہ سے سنتا تھا۔ مرزا کام بخش عالمگیرؒ کا نہایت چہیتا بیٹا تھا۔ اس کے کوکہ[۱] پر قتل کا الزام قائم ہوا۔ عالمگیر نے حکم دیا کہ عدالت میں تحقیقات کی جائے۔ کام بخش نے اس کی حمایت کی۔ عالمگیر نے کام بخش کو دربار میں بلا بھیجا۔ کام بخش اس کو بھی ساتھ لاتا تھا اور اپنے آپ سے جدا نہیں کرتا تھا۔ عالمگیرؒ نے حکم دیا کہ کام بخش بھی کوکہ کے ساتھ قید کیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔

۷۔ عالمگیرؒ نے شاہ پرستی کو مٹا کر خدا پرستی کو رواج دیا۔ بادشاہ کو ایک مافوق الفطرۃ وجود خیال کیا جاتا تھا۔ وہ خدا کا مظہر تھا۔ اکبر کی زیارت عبادت شمار ہوتی تھی۔ روزانہ صبح کو انسانوں کی بھیڑ یہ عبادت کرتی تھی۔ دربار میں بادشاہ کو سجدہ کیا جاتا تھا۔ شاہجہاں نے سجدہ بند کیا لیکن زمین بوسی کو جاری رکھا۔

---

[۱] انّا کا بیٹا، دودھ شریک بھائی۔

حالانکہ سجدہ ہی کی ایک صورت تھی، بادشاہ کے خورد ونوش، لباس، پوشاک اور سیر وسفر اور ناز نخروں پر لاکھوں روپیہ صرف ہوتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین کے احکم الحاکمین کا یہ اصلی اور پیدائشی حق ہے۔ کوئی شخص عرض معروض بھی عبودیت اور پرستش کے طریقے ادا کیے بغیر نہیں کرسکتا تھا۔ مولانا شبلیؒ کے بقول آسمان پر کوئی اور خدا ہو تو ہو لیکن دنیا کا خدا بادشاہ ہی تھا ——

لیکن اسلام کہتا ہے انسان کی اختیاری اور دنیوی زندگی کا بھی بادشا خدا ہی ہے انسان تو اس کا خلیفہ اور نائب ہے۔" اس لیے عالمگیرؒ اس صریح شرک کو کس طرح گوارا کرسکتا تھا؟ اس نے ان تمام خرافات کو ختم کردیا اور بادشاہ یعنی اپنی ذات کو عام انسانوں کے درجے تک اتار لانے کی عملی کوشش کی —— عہد تیمور سے اکبر اور شاہجہاں تک جن خرافات نے روز افزوں وسعت حاصل کی تھی، عالمگیرؒ ان سب کو یک لخت ختم نہیں کرسکا۔ البتہ شاہ پرستی کی جڑوں پر اس نے تیشہ ضرور چلایا اور اسے بے دم کرنے کی کوشش ضرور کی۔

۸۔ ۱۰۷۹ھ میں درشن کا طریقہ بند کرنے کے علاوہ دربار میں جو شعراء مقرر تھے اور بادشاہ کی قصیدہ خوانی میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے تھے، یہ لوگ بڑی بڑی تنخواہیں پاتے تھے۔ عالمگیرؒ نے انھیں بھی موقوف کردیا۔

۹۔ تمام تکلفات سلطنت جو شاہی اور شاہ پرستی کے لوازمات اور یادگار میں تھیں ایک ایک کرکے ختم کردیں، حتیٰ کہ چاندی کی دواۃ کے بجائے چینی کی دواۃ کا حکم دیا۔ انعام کی رقمیں چاندی کی سینیوں اور طشتریوں میں دی جاتی تھیں۔ حکم دیا کہ ڈھال میں لائی اور دی جائیں۔ زربفت وغیرہ کی قیمتی خلعتیں بھی موقوف کردیں۔ دربار میں سلام کرتا بھی خلاف ادب ہوتا۔ صرف سر پر ہاتھ رکھ دیا جاتا تھا۔ اس کو موقوف کرکے سلام مسنون کو رواج دیا۔

۱۰۔ اکبر نے جن ملحدانہ، کافرانہ اور مشرکانہ رسوم و قوانین اور طریقوں کو رواج دیا تھا، عالمگیرؒ نے ایک ایک کو چن کر مٹایا اور کھرچ کھرچ کر نکال پھینکا۔ عام درباریوں کا لباس گھیردار پائجامہ اور ہندوانی پگڑی تھی۔ راجاؤں کی طرح سلاطین زیور پہنتے تھے۔ دربار میں سلام کے بجائے جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے سجدہ اور ماتھا ٹیکی رائج تھی۔ عالمگیرؒ نے تمام غیر اسلامی شعائر مٹا کر اسلامی شعائر کو رواج دیا۔

۱۱۔ پارسیوں کی تقلید میں کاروبار سلطنت میں شمسی سنہ رائج تھا۔ عالمگیرؒ نے عنان سلطنت ہاتھ میں لیتے ہی یعنی جلوس کے ایک ہی برس بعد ۱۰۶۹ھ میں قمری سنہ رائج کر دیا۔

۱۲۔ گانا بجانا اور ناچ رنگ بھی دربار کے ساتھ لازم سا ہو گیا تھا۔ سلطان عالمگیرؒ نے اس کو بالکل موقوف کر دیا۔ لوگوں نے ایک فرضی جنازہ کا جلوس نکالا اور ہائے وائے کرتے ہوئے قلعہ کے سامنے سے گذرے۔ سلطان نے قلعہ کے بالائی حصّہ سے دیکھا اور دریافت کیا، کیا ہے؟ لوگوں نے کہا حضور! موسیقی کا جنازہ ہے۔ عالمگیر نے کہا لے جاؤ، دور لے جا کر دفن کرنا۔

۱۳۔ سلطان نے غیر اسلامی رسوم و رواج اور مشرکانہ خرافات سے صرف دربار ہی کو پاک نہیں کیا بلکہ باقاعدہ احتساب کا محکمہ قائم کیا اور تمام اضلاع میں محتسب مقرر کیے جن کا کام منہیات سے روکنا اور ممنوعات سے باز رکھنا تھا۔ اس محکمہ کے افسر اعلیٰ علامہ وجیہہ الدینؒ تھے۔

۱۴۔ دینی تعلیم کے سوتے اکبر کے زمانہ میں اس کی بے دینی کی وجہ سے خشک ہونے لگے تھے۔ سلطان عالمگیرؒ نے علوم دینیہ کی سرپرستی کی۔ شہر در شہر اور قصبہ در قصبہ مدارس قائم ہوئے۔ علماء کے وظیفے جاری تھے اور وہ بافراغت

درس و تدریس اور علمی خدمات میں مشغول تھے۔

مولانا شبلیؒ نے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، ان کے علاوہ بھی کچھ اور پہلو ہیں جو ہمارے سامنے رہنا چاہیے ـــــ لال بہاری بھوجپوری مترجم مت اچھرانے دورِ عالمگیری کی تعریف یوں کی ہے۔

دورِ شش چوں دورِ قدح پُر نشاط!

دزمانش مانند ایامِ شباب پرسرور وانبساط

یعنی اس کے دور میں خوشحالی اور رفاہیت عام تھی جس سے ہندو مسلم، ملک کے سب ہی باشندے مستفید ہو رہے تھے۔

ہملٹن کی رپورٹ

کپتان الگزنڈر ہملٹن نے عالمگیرؒ کے عہد میں ہندوستان کی سیاحت کی ہے۔ اس کے سفرنامے کے چند اقتباسات سے دورِ عالمگیری کی خوشحالی، مذہبی آزادی اور امن و عدل وغیرہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

● مذہبی آزادی :۔ ریاست کا مسلّمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانے میں کرتے تھے جب کہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی وہ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں لیکن ان کی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ شوہروں کے مردے کے ساتھ ستی ہوں۔ (اورنگ زیبؒ کی اصلی تاریخ۔ صفحہ ۱۲۷-۱۲۸)

شہر سورت میں تخمیناً سو مختلف مذہب کے لوگ رہتے ہیں، لیکن ان میں کبھی کوئی سخت جھگڑے ان کے اعتقادات و طریقۂ عبادت کے متعلق نہیں

ہوتے۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقہ سے اپنے معبود کی پرستش کرے، صرف مذہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے۔ (ج ۱ صـ ۱۶۲)

• تجارت :۔ عبدالغفور نامی ایک سوداگر سورت میں رہتا ہے۔ جس کا سرمایہ تجارتی، "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی کل تجارت و سرمایہ کے برابر ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک سال میں مال کے تقریباً ۲۰ جہاز بھر کر وہ بھیجتا ہے۔ ہر ایک جہاز ۳۰۰ سے لے کر ۸۰۰ ٹن کا تھا اور ہر ایک میں صرف اس کا مال دس ہزار پونڈ اور بعضوں میں ۲۵۰۰۰ ہزار پونڈ کا تھا اور جب یہ مال باہر روانہ ہو چکتا تھا تب بھی اس سے زیادہ مال اس کے پاس آئندہ کے لیے باقی رہتا تھا۔ (ج ۱ صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸)

انگریز ملاحوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر بہ حیثیت کپتان اور میٹ ملازم رکھتے ہیں۔ (ج ۱۔ صفحہ ۲۳۳)

• ارزانی :۔ بیف تین فاردنگ (چند کوڑیوں) میں نصف سیر ملتا ہے (ج ۱ صـ ۱۶۱) ایک ٹن نمک ایک کراؤن میں فروخت ہوتا تھا جو غالباً دو یا ڈھائی روپیہ کے برابر ہوتا تھا۔ (ج ۱۔ صـ ۲۵۵) کارومنڈل کے ساحل پر ساڑھے تین آنے میں ۲۰ پونڈ مچھلی ملتی تھی جو ذائقہ میں ٹراؤٹ اور سامن کے برابر ہوتی تھی (ج ۱۔ صـ ۳۷۹) شہر کٹک میں مکھن ایک آنے میں ایک پونڈ ملتا تھا۔ (ج ۱۔ صـ ۳۹۲) احمد آباد، دولت، ثروت اور عظمت میں یوروپ کے بڑے بڑے شہروں سے کچھ ہی کم ہوگا صرف شہر سورت کی آمدنی ایک لاکھ باسٹھ ہزار پانچ سو پونڈ ہے اور احمد آباد کی آمدنی اس سے دگنی ہے۔ (ج ۱۔ صـ ۲۶۶)

• امن و عدل :۔ ڈاکہ اور قتل کی خبریں کم سنی جاتی ہیں۔ ایک

غیر ممالک کا باشندہ اِس ملک میں کہیں جائے کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کیوں جاتا ہے؟ (ج ۱ ص ۲۷۹)

بحری قزاقی کے انسداد کے لیے اورنگ زیبؒ کا بحری بیڑا ڈنڈا راجاپور میں رہتا تھا۔ اس کا کمانڈر سیدی خان تھا جس کے ماتحت ۳۰،۰۰۰ ہزار فوجی رہتے تھے (ج ۱ ص ۲۴۴)

• صنعت وحرفت :- ہندوستان میں عمدہ سے عمدہ کپڑا اور بکثرت ایسا ملتا تھا جس کی مثال یوروپ میں ملنی دشوار تھی۔ پھر فرماتے ہیں کہ یہاں روئی کا ایک ایسا کپڑا بُنا جاتا ہے جو بہت باریک اور ملائم ہوتا ہے (ڈھاکہ کی ململ) اور اس قدر پائیدار کہ ایسا انھوں نے کبھی اپنی زندگی میں استعمال نہیں کیا (ج ۱ ص ۱۲۵) کپتان الگزنڈر ہملٹن کو ملتان میں بہترین تیر و کمان بنانے والے کاریگر ملے۔ لوہا بکثرت پایا۔ حتیٰ کہ جہازوں کے واسطے لوہے کے لنگر بھی ڈھلتے تھے۔ (ج ۱۔ ص ۳۹۲) سندھ کا شہر "ٹھٹہ" دریائے انڈس سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ دریا سے بذریعہ کینالس اور نہریوں کے شہر و باغات میں آب رسانی کا انتظام کیا گیا ہے۔ (ج ۱ ص ۱۲۱)

کپتان ہملٹن کی اس رپورٹ سے (جو مرزا یار جنگ بہادر میر عدل (چیف جسٹس) حیدرآباد دکن کی کتاب "اورنگ زیب کی اصلی تاریخ" سے نقل کی گئی ہے) یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اورنگ زیبؒ نے جو اسلامی اصلاحات اور کارنامے انجام دیے ان سے ملک کی خوشحالی اور ترقی میں بے مثل اضافہ ہوا۔ اسلامی اصلاحات سے دنیوی اعتبار سے بھی کامیابی اور کامرانی نے قدم چومے۔ غرضکہ عالمگیر ایک عظیم حکمراں اور ایک عظیم مصلح تھا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ اللھم ارزقنا مثلہ

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ایک عظیم مفکر اور مجدّد

۱۱۱۴ھ — ۱۱۷۶ھ

مفتیوں، قاضیوں اور مجاہدوں کا وہ فاروقی خاندان جس کے گل سرسبد شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں، اس کے مورث اعلیٰ شیخ شمس الدین مفتی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو ہندوستان تشریف لائے اور رہتک میں آباد ہوئے۔ ایک عرصہ تک یہ خاندان رہتک ہی میں آباد رہا۔ افتا اور قضا کے فرائض اسی خاندان سے متعلق رہے۔ پھر یہ خاندان دہلی منتقل ہوگیا۔ شیخ وجیہہ الدین شہیدؒ اسی خاندان میں سیف و قلم اور علم و تقویٰ اور شریعت و طریقت ہر پہلو سے کامل اور جامع شخصیت گذرے ہیں۔ آپ شاہ ولی اللہ کے دادا ہیں اور شاہ عبدالرحیمؒ آپ کے والد محترم ہیں۔ شاہ اہل اللہ صاحب آپ کے برادر بزرگ ہیں۔ اور صاحبزادوں سے تو دنیا واقف ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالغنیؒ اور آپ کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے بھی دنیا واقف ہے۔ آپ شاہ عبدالغنی صاحب کے صاحبزادے تھے، غرض کہ: ؏

این خانہ ہمہ آفتاب است

اشاعت دین، احیاء سنت اور استیصالِ بدعات کے لیے یہ خاندان

ہمیشہ آگے آگے رہا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نہ صرف ایک عالم دین، ایک فقیہہ اور مجتہد، ایک محدّث اور حکیم الاسلام ہیں بلکہ آپ ایک عظیم مفکر، مصلح اور مجدّد بھی ہیں۔

تعلیم و تربیت

شاہ صاحب ۴؍ شوال ۱۱۱۴ھ بروز چہار شنبہ طلوع آفتاب کے وقت پیدا ہوئے، ان کی والدہ محترمہ بنت شیخ محمدؒ بھی پاکباز اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ موصوفہ نے اپنی چھاتی سے دودھ کی دھاروں کے ساتھ اخلاق بھی آپ کو سکھایا، انسانیت بھی آپ کے ذہن و مزاج میں رچائی بسائی۔ آپ نے پانچویں برس میں قرآن مجید ختم کر لیا۔ ہوش سنبھالتے ہی اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ اور اپنی والدہ محترمہ سے نماز سیکھ لی اور ساتویں برس باقاعدہ نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اسی عمر میں روزے بھی رکھنے لگے، تہذیب اخلاق کا مادّہ آپ کے اندر فطری طور پر موجود تھا اس لیے معاشرتی آداب، نشست و برخاست کا طریقہ، بول چال اور گفتگو کا سلیقہ کم سنی ہی میں سیکھ لیا۔ آپ اپنے بڑوں کی بات پر ہمیشہ "بسر و چشم" "بجا ارشاد" اور "بہت اچھا" کہتے۔ البتہ اپنے ہمجولیوں سے خوب کھل کر گفتگو کرتے لیکن تہذیب اور شائستگی کے دائرہ سے کبھی قدم باہر نہ نکالتے۔ زندگی کی ساتویں بہار تھی کہ آپ نے فارسی شروع کر دی اس کے بعد ہی آپ نے عربی صرف و نحو کی طرف توجہ کی اور دو ڈھائی سال کے عرصہ میں خاصہ ملکہ پیدا کر لیا، پھر آپ نے معقولات کی طرف رخ کیا، چونکہ ذکی اور ذہین تھے لہٰذا ان علوم و فنون میں ذوق و شوق سے حصہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ذہانت اور طبّاعی کا جوہر اور زیادہ نکھر گیا اور چمک اٹھا خصوصاً منطق میں آپ نے مہارت حاصل کی غرض کہ ۱۴ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے مختلف قسم کے دینی اور دنیوی علوم نقلی اور عقلی فنون، دونوں میں آپ نے درجہ تکمیل

حاصل کرلیا اور یہ اس خاص بخشش خداوندی اور عطیۂ الٰہی کا فیض تھا جسے حافظہ، ذہن، جودت اور طبّاعی کہتے ہیں۔ محنت اور جانفشانی، شوق اور ذوق کے اوصاف عالیہ کا بھی اس کامیابی اور سرفرازی تک پہنچانے میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ۱۴ سال کی عمر میں آپ کی شادی ہوگئی اور شادی ہوتے ہی چند جانکاہ حادثات پیش آئے۔ آپ کی خوش دامن، خسر، والدہ اور والد صاحب چاروں سرپرست یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوگئے مگر شادی کے جھمیلوں اور ازدواجی زندگی کے بکھیڑوں نے آپ کے علمی ذوق و شوق کو قطعاً متاثر نہیں کیا اور نہ پیہم حوادث نے آپ کے صبر و استقلال میں کمزوری پیدا کی۔ بلکہ ان چیزوں نے اور زیادہ مہمیز کا کام کیا۔ آپ نے خوشی اور غم کے دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے پہلے تفسیر میں اور پھر علم حدیث میں درک حاصل کیا اور مہارت پیدا کی۔

دستارِ فضیلت اور ذوقِ مطالعہ

شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے اپنے انتقال سے کچھ پہلے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں دہلی کے تمام معززین خصوصاً اہل علم و تقویٰ، علماء، مشائخ اور قضاۃ نے شرکت فرمائی۔ اس اجتماع میں شاہ ولی اللہ کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی گئی، خرقۂ خلافت عطا کیا گیا۔ درس و تدریس اور سلوک و ارشاد کی اجازت دی گئی۔ شاہ عبدالرحیم صاحب نے آپ کے لیے دعا فرمائی۔ تمام اہل علم اور اہل تقویٰ حاضرین نے "آمین" کہا۔

شاہ صاحبؒ نے سبقاً سبقاً پڑھے ہوئے علم کو کافی شمار نہ کیا بلکہ دستارِ فضیلت حاصل کرلینے کے باوجود آپ نے گہری نظر سے عمیق مطالعہ کرنا ضروری خیال کیا۔ رحیم بخش صاحب کے بقول :-

"آپ نے اجازت وسند حاصل کرنے کے بعد بغیر استاد کے کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور نہایت سخت محنتیں کرنے لگے۔ آپ کتب بینی میں اس درجہ مستغرق رہتے تھے کہ رنج و راحت، شب و روز مشاغل علمیہ میں بالکل محسوس نہ ہوتے تھے۔ ایک سال کی سخت محنت سے تمام پڑھے ہوئے علوم از سر نو دیکھ ڈالے اور اس محویت اور استغراق کے ساتھ کہ بقدر ضرورت کچھ کھا لیتے یا تھوڑا سا آرام فرما لیتے ورنہ رات دن بجز کتب بینی کے دوسرا کام نہ تھا۔"

درس وتدریس اور اشاعت دین

اپنے والد شیخ عبدالرحیم صاحبؒ کی وفات کے بعد آپ نے درس و تدریس کی مسند کو زینت بخشی۔ علوم دینیہ اور عقلیہ دونوں میں آپ استاد تسلیم کر لیے گئے، عوام اور خواص میں آپ کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ حتیٰ کہ ایک دور ایسا بھی آیا کہ بڑے بڑے اساتذہ اور ماہرین فن آپ کی شاگردی پر فخر کرنے لگے۔ طلبہ اور تشنگان علوم دور دور سے آتے اور آپ کے والد کے قائم کیے ہوئے مدرسہ رحیمیہ میں داخل ہو کر آپ سے اپنی تشنگی بجھاتے بلکہ سیر ہو کر جاتے تقریباً ۱۲ برس تک آپ نے تدریسی فرائض انجام دیے اور علوم نبویؐ کی اشاعت کی۔ حتیٰ کہ حدیث و قرآن کا چرچا خوب ہوا۔ لوگوں میں دینی علوم کا ذوق شوق پیدا ہوا۔ رحیم بخش صاحب لکھتے ہیں "اکثر علمی سوسائٹیوں میں اصول حدیث کا ذکر چھڑ گیا اور طالب علموں کے ہر ہر حلقے میں اس پر زور شور سے بحثیں ہونے لگیں۔ اس زمانے میں تفسیر و حدیث میں روز افزوں ترقی تھی اور علوم فلسفہ و منطق کا بازار سرد تھا۔ غرض کہ شاہ صاحبؒ کا یہ زمانہ ہر طرح سے قابل مبارکباد تھا۔ علوم فقہ اور معانی و بلاغت کو جس قابلیت اور دل سوزی سے آپ نے رواج دیا وہ بہر صورت آپ کا فرض منصبی سمجھا جاتا ہے لیکن قرآن و حدیث کی

اشاعت و تشہیر میں جو آپ نے کوشش کی ہے اس کے احسان سے ہندوستان کبھی سر نہیں اٹھا سکتا۔"

آگے لکھتے ہیں: "آپ کی خداداد قابلیت اور محنت کشی کی شہرت نے شوقین طلبہ کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا جو دور دراز ملکوں کی سنگلاخ اور دشوار گذار گھاٹیاں طے کر کے آتے اور آپ کی درسگاہ میں داخل ہونے کو سرمایۂ ناز و فخر سمجھتے تھے۔ شاہ صاحب ہر ایک طالب علم کے ساتھ خواہ وہ کسی رتبہ کا ہوتا عام اخلاق اور فیاضی سے پیش آتے اور سب کے ساتھ رحیمانہ و شریفانہ برتاؤ کرتے قطع نظر اس کے کہ انھیں نہایت محنت و جفاکشی اور دل سوزی سے تعلیم دیتے، ان کے ضروری اور لابدی حوائج کے رفع کرنے میں انتہا سے زیادہ ساعی ہوتے بلکہ بعض محنتی اور قابل طلبہ کو اپنی ذات خاص سے امداد اور بہت ہی تسلی و دلجوئی سے انھیں خوش رکھتے۔"

اساتذۂ حدیث شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ یونہی محدّث نہیں بن گئے تھے بلکہ اس مرتبہ تک پہنچنے کے لیے آپ کو بڑے پاپڑ بیلنا پڑے تھے۔ ہندوستان کے علاوہ تکمیل علم کا شوق آپ کو حجاز مقدس تک لے گیا۔ آپ نے ۱۱۴۳ھ میں فریضۂ حج ادا فرمایا اور کامل ایک سال تک وہاں مقیم رہے اور مختلف مشاہیر اہل علم سے سند حدیث حاصل کی۔ آپ نے حجازِ مقدس میں جن تین بزرگوں سے علم حدیث کی اجازت حاصل فرمائی ان میں سے ایک شیخ وفد اللہ مغربیؒ ہیں، دوسرے شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنیؒ ہیں اور تیسرے بزرگ شیخ تاج الدین حنفیؒ ہیں۔ یہ تینوں بزرگ جن سے شاہ صاحب نے علم حدیث کی تکمیل اور اجازت کے سلسلہ میں شرف تلمذ حاصل کیا اپنے دور کے مانے ہوئے اور اونچے پائے کے اہل علم اور اہل تقویٰ میں شمار ہوتے تھے۔ تینوں

حضرات نے خوشی خوشی شاہ صاحبؒ کو اپنی شاگردی میں لیا اور سند حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی۔ آپ نے ۱۱۴۵ھ میں دوبارہ فریضۂ حج ادا فرمایا اور پھر واپس وطن تشریف لے آئے اور مدرسہ رحیمیہ میں پہلے سے زیادہ شوق اور انہماک کے ساتھ حدیث کے درس و تدریس میں لگ گئے۔ سیکڑوں کی تعداد میں طالبان علم حدیث ٹوٹ پڑے اور ایک ایک وقت میں اجازت اور سند حاصل کر کے پورے ملک میں اور بیرون ملک میں پھیل کر علم حدیث کی اشاعت میں مصروف ہونے لگے۔ شاہ صاحبؒ کی درسگاہ کیا تھی، علومِ حدیث، تفسیر اور فقہ کا سرچشمہ تھا، جہاں سے تشنگان علوم، اپنی تشنگی بجھا کر اور سیر ہو کر جاتے تھے، اور نہ معلوم کتنے پیاسوں کو سیراب کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ عمل بالحدیث کا جو بیج شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے بویا تھا اور جس کی آبیاری کے لیے شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے مدرسہ رحیمیہ قائم کیا تھا اس باغ کو مؤلف "حیات ولی" کے بقول شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی اَن تھک کوششوں سے یہاں تک سینچا کہ وہ چند ہی روز میں سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگا اور اس کے پھلوں اور پھولوں سے لوگ گودیاں بھر بھر کر جانے لگے۔ خوشا نصیب کہ ہندوستان کے گلی کوچوں میں حدیث نبویؐ کے چرچے ہونے لگے۔

اخلاق و عادات

کہتے ہیں کہ بچّے کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں اور ہونہار بروا کے پات چکنے چکنے ہوتے ہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے اس کے خمیر میں اسی کی صلاحیتیں شامل فرما دیتا ہے۔ گویا اس کی گھٹی میں اس کارِ عظیم کی استعداد ڈال دی جاتی ہے اور وہ ابتدا ہی سے طبعی قوانین کے تحت تیار کیا جاتا ہے۔

مسبب حقیقی کی جانب سے ظاہری اسباب بھی اس کے لیے ویسے ہی فراہم کر دیے جاتے ہیں۔ نسلی خصوصیات، خاندانی اوصاف، والدین کی امنگیں، تمنائیں اور تربیت کا سلیقہ، گھر کا ماحول، فطری صلاحیتیں، نظام تعلیم و تربیت، اساتذہ کی شفقتیں اور بلند کردار وغیرہ سب اسی عظیم مقصد کے لیے خاموشی سے مددگار بنتے اور موافق ثابت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب کے سلسلہ میں بھی یہی تقدیر کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے جو عظیم اصلاحی اور تجدیدی، فکری اور علمی کام لینا چاہتا تھا اس کے آثار آپ میں بچپن ہی سے ہویدا تھے۔ آپ اپنے بچپن اور لڑکپن میں کبھی بھی کھلنڈرے نہیں رہے۔ متانت اور سنجیدگی لڑکپن میں بھی آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ سادگی اور صفائی کے ساتھ ہنس مکھ رہنا آپ کی خصوصیت، جو مل جائے وہ پہن لینا، جو سامنے آجائے وہ ہنسی خوشی کھالینا، اور شوق و ذوق سے تعلیمی مشاغل میں منہمک رہنا یہ تھے وہ اوصاف جن کے ساتھ آپ کا لڑکپن گذرا —— کہتے ہیں جوانی دیوانی ہوتی ہے لیکن شاہ صاحبؒ کا شباب، شہاب ثاقب بن کر چمکا۔ اس جوانی سے آپ بالکل محروم رہے جو دیوانی ہوتی اور دیوانہ کرتی ہے۔ ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک صاف شباب نے آپ کو جو کچھ دیا وہ علم و تقویٰ تھا۔ جس کے موتیوں سے آپ نے اپنی گود بھرلی اور جس کے پھولوں سے آپ نے نہ صرف اپنی زندگی کو مزین کیا بلکہ ان کی مہک سے نہ معلوم کتنی زندگیوں کو معطر کر دیا۔ آپ نے شباب کی سرحد سے گذر کر جب کہولت کے میدان میں قدم رکھا تو آپ کی زندگی کو علمی شان و شوکت اور تجربہ کی پختہ کاری اور طبائع کی ہوشمندی نے اور بھی زیادہ چار چاند لگا دیے۔ پھر تو آپ چنداں آفتاب اور چنداں مہتاب بن کر چمکے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا درس و تدریس کی گرم بازاری بڑھتی گئی۔ علم و تقویٰ میں

اضافہ ہوتا گیا، اخلاق وعادات اور کردار بھی اتنا ہی نکھرتا گیا، زہد وارتقا کی منزلیں بھی طے ہوتی رہیں، تالیف وتصنیف اور وعظ وارشاد کے ذریعہ بھی آپ نے خوب خوب جولانیاں دکھائیں۔ حتیٰ کہ فکر وعمل کے تمام میدانوں کا آپ نے جائزہ لیا اور ایک ایک مرض کی نشاندہی کی اور ایک ایک کمزوری پر انگلی رکھی اور ہر دکھ کا مداوا تجویز کیا۔

فضل وکمال

شاہ صاحبؒ کی شخصیت جامع شخصیت تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، کلام، سیر مغازی اور معانی اور بلاغت وغیرہ میں سے کونسا علم وفن ہے جس میں آپ اجتہادی مہارت نہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ آپ نے اس دور میں جب کہ قرآن فہمی تفاسیر کی لمبی چوڑی کتابوں پر منحصر سمجھی جاتی تھی جس کے لیے زمرۂ علماء میں شامل ہونا ضروری تھا، عام لوگوں کے لیے گویا قرآن کے دروازے بند تھے۔ آپ نے ترجمہ قرآن کر کے قرآن فہمی کا دروازہ عام لوگوں کے لیے کھول دیا۔ آپ نے علماء کی رہنمائی بھی فرمائی۔ فوز الکبیر، فتح الخبیر اور تاویل الاحادیث جیسے مختصر مگر جامع رسالے لکھ کر بڑی بڑی کتابوں سے مستغنی کر دیا۔ فقہاء اربعہ کے مذاہب کی تحقیق کی۔ صحابہؓ اور تابعینؒ کے اقوال کی چھان بین کی۔ فقہ، قرآن وحدیث کا بند دروازہ پھر سے کھولنے کی کوشش فرمائی۔ اسرار حدیث بیان فرمائے، احکام دین کی حکمتیں سمجھائیں، حجۃ اللہ البالغہ جیسی بے نظیر کتاب لکھ کر عظیم اجتہادی کا کارنامہ انجام دیا۔ رسالہ انصاف اور عقد الجید وغیرہ لکھ کر فقہی تنگ نظری کا سدّباب کیا اور اندھی تقلید کی اندھیاری میں وسعت دینی کا چراغ روشن فرمایا۔ آپ نے عقائد، تصوف اور سلوک کی راہوں میں بھی مجتہدانہ روش اختیار فرمائی۔ آپ کی تصانیف آپ کے فضل وکمال کا زندہ ثبوت ہیں۔ معاملہ فہمی، پیچیدہ مسائل کی تحقیق اور جزرسی میں

آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ انشاء پردازی، خوش تقریری اور فصاحت و بلاغت میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

مولانا علی میاں جیسے بزرگ جو عربوں کی طرح عربی لکھتے اور بولتے ہیں، شاہ صاحبؒ کی عربی دانی اور اس میں آپ کی ادیبانہ مہارت اور ژرف نگاہی کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اس سلسلہ میں آپ کے مداح ہیں بلکہ آپ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

آپ کا کلام شاہ صاحب نہ صرف ایک مایۂ ناز نثار اور قادر الکلام انشاء پرداز تھے بلکہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ لوگوں نے گیارھویں صدی کے شعراء کے زمرہ میں آپ کو جداگانہ شمار کیا ہے اور شاعری کے علاوہ علم و ادب میں تمام ماہرین فن کے طبقوں میں آپ مسلّم ادیب گنے گئے ہیں جب ہم گیارھویں صدی کے شعراء کی فہرست میں آپ کو ڈھونڈتے ہیں تو نہایت روشن اور جلی حرفوں میں آپ کا نام نامی ثبت پاتے ہیں۔ (ص ۵۰۵ حیات ولی، نمونہ کے طور پر صرف چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) اَلاطالَ شوق الابرارِ الی لقائیَ وانّی لَاَشدُّ شوقاً الیہم منہم

(۲) عاشق شوریدہ ام یا عشق ماجانانہ ام من ندانم بادہ ام یا بادہ را پیمانہ ام

(۳) توئی مقصودِ اہلِ دل توئی مشتاق و ہمدم ہم توئی اول توئی آخر توئی ظاہر توئی باطن

(۴) از فرطِ تمایل ز آغوش خود افتم از ہر بُنِ مویم جوشد مئے دیگر

(۵) نازنینِ وطنم سوئے عدن باز روم تابکے محنتِ مہجوری و دوری بکشم

(۶) گوہرے از عدنم سوئے عدن باز روم تابکے ہمدمئے سنگ بود شیوۂ من

(۷) آہوئے از ختنم سوئے ختن باز روم تابکے بستۂ زنجیر تعلق باشم

(۸) شاہ ملکِ یمنم سوئے یمن باز روم بوئے جاں میرسد از باد یمن در دو جہاں

بیا ساقی بدہ جامے شرابے (۹) کہ مخمور صبوحی و الستم
بے قرارم روز و شب بے روئے یار (۱۰) باز بنما روئے یارم یا قدیر

وفات اس عالم فانی میں جو چیز وجود پذیر ہوتی ہے وہ فنا پذیر بھی ہوتی ہے۔ جو شخص آنکھیں کھولتا ہے اس کی آنکھیں ایک دن بند ضرور ہوتی ہیں۔ حیات کا مزہ لوٹنے والے موت کا مزہ بھی چکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ زندگی کا لطف اٹھانے والے فنا کے گھاٹ بھی اترتے ہیں۔ ہر چھوٹا بڑا، ہر امیر غریب، ہر خاص و عام، ہر عالم اور عامی، ہر دنیا دار اور ہر دیندار جو اس دنیا میں آیا ہے وہ جانے پر ضرور مجبور ہوا ہے۔ جب انبیاء اور اولیائ کو بھی جانا پڑا تو اوروں کا شمار ہی کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ بھی اپنے مولیٰ کے آگے سرخ رو ہونے کے لیے موت کی گود میں سونے پر مجبور ہوئے۔ تریسٹھ سال کی عمر تھی۔ چند روز کی معمولی سی بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۱۷۶ھ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ شاہجہاں آباد کے جنوبی جانب دفن ہوئے۔ تاریخ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے۔ ع

از بود امام اعظم دیں

کارنامے صاحب دعوت و عزیمت اور صاحب تجدید و احیاء دین جیسے بزرگوں نے شاہ صاحبؒ کے جن کارناموں پر روشنی ڈالی ہے وہ کچھ اس طرح ہیں۔

۱۔ اسلام کو زندگی کے ایک ہمہ گیر پروگرام کی حیثیت سے پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔

۲۔ اسلام کو آپ نے اس حکمت و دانائی اور حسن توازن کے ساتھ پیش کیا کہ آپ کے بعد کی ہر تحریک پر آپ کی فکری چھاپ پائی جاتی ہے۔

۳۔ اعتدال اور جامعیت آپ کا بڑا کارنامہ ہے چنانچہ فقہ اور تصوف کے تمام نمایاں مکاتب فکر کا رنگ، فکر ولی اللّٰہی میں سمویا ہوا اور جھلکتا نظر آتا ہے۔

۴۔ آپ نے مسلمانوں کو قرآن و سنّت سے دوبارہ وابستہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔

۵۔ دینی فکر اور قرآن و حدیث کی تعلیم پر مشتمل ایک ایسی تحریک پیدا کی کہ بہت بڑے پیمانہ پر ہندوستان کی امت مسلمہ اس سے متاثر ہوئی اور آپ کے فکر و فلسفہ، آپ کی بیان کردہ حکمتِ دین اور نظام تعلیم کے بل بوتے پر دو ڈھائی سو سال تک مسلمان تحریک بداماں رہے حتیٰ کہ آپ کی تحریک کے اثرات آج بھی نمایاں ہیں۔

۶۔ یہ آپ ہی کی فکری اور تعلیمی جہاد کا اثر تھا جو سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک جہاد کی صورت میں نمایاں ہوا۔

۷۔ آپ نے جدید علم کلام سے کام لیا۔ قرآن و حدیث کا طرزِ استدلال دل میں اتر جانے والی سیدھی سادھی دلیلیں، فلسفیانہ موشگافیوں سے گریز اور روزمرہ کے حقائق سے استشہاد وغیرہ۔

۸۔ ملک کے اجتماعی حالات پر آپ نے غیر معمولی اثر ڈالا۔ بھرپور تنقید کی، علماء، مشائخ، امراء اور اہل سیاست ہر ایک کو جھنجھوڑا اور فرض یاد دلایا

۹۔ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دے کر اسلامی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ احمد شاہ آیا اور اس نے اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں روڑا بننے والوں کی خوب سرکوبی کی۔

۱۰۔ آپ نے خیالات کے الجھے ہوئے جنگل کو صاف کر کے فکر و نظر کی

ایک صاف اور سیدھی صراط مستقیم واضح کی، موجودہ حالات کے خلاف بے چینی پیدا کی اور تعمیر نو کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا کہ جس کے بل بوتے پر جیسا کہ مذکور ہوا ایک عظیم تحریک اٹھی۔ آپ کی تصانیف میں زندگی کے ہر پہلو پر مجددانہ گفتگو موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کا کوئی اعلیٰ دماغ مفکر زندگی اور فلسفہ زندگی اور نظام زندگی کی گتھیاں سلجھا رہا ہے اور اس طرح کہ باسی پن بالکل محسوس نہیں ہوتا۔

۱۱۔ آپ نے صرف تنقید ہی نہیں کی، تعمیری فکر پیش کیا۔ فلسفۂ اسلام کی بنیاد رکھی، حکمت دین پر امام غزالیؒ سے بڑھ کر کام کیا۔

۱۲۔ آپ نے اسلام اور جاہلیت کی تاریخی کشمکش کا واضح تصور پیش کیا۔ جاہلی حکومت اور اسلامی حکومت کا فرق اچھی طرح واضح فرمایا۔

آپ پر اللہ کی رحمت ہو!

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ

ایک عظیم مصلح اور مجدّد

۱۱۱۵ھ تا ۱۲۰۶ھ

کسی بڑی شخصیت کے کارناموں کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے ان حالات کا جائزہ ضروری ہے جن میں اس نے اپنی جان گھلا کر اصلاح اور سدھار کا کوئی بڑا کام انجام دیا ہو۔ حالات کس قدر بھیانک تھے؛ تاریکی کتنی گہری تھی، عقائد کس قدر بگڑ گئے تھے، اخلاق و کردار میں کس قدر پستی آگئی تھی، معاشرہ کن برائیوں، بے حیائیوں اور بداخلاقیوں میں مبتلا تھا؟ شرک و بدعت کی وبا، توحید کی نام لیوا ملّت میں کس قدر عام تھی؟ سیاست و اجتماعیت میں کیا رخنے پیدا ہو گئے تھے؟ ان تمام پہلوؤں سے بارہویں صدی کی اسلامی دنیا کے سرسری جائزہ سے ہی شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے عظیم اصلاحی اور انقلابی کارنامہ کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

بالآخر جب دنیا پھر تاریکی میں مبتلا ہو گئی، مسلمان کتاب و سنّت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے، ایک اللہ کی جگہ سیکڑوں معبود بنا لیے گئے، مصر میں بدوی رفاعی، عراق و ہند میں عبدالقادر جیلانیؒ، مکہ اور طائف میں ابن عباسؓ، یمن میں ابن علوان سے مرادیں مانگی جانے لگیں اور مسلمان ہر شجر و حجر کے آگے

جھکنے لگے تو پھر عرب ہی کے بے آب وگیاہ سرزمین سے تذکیر وہدایت کا آفتاب ضو فگن ہوا اور خاک عرب کے وہ ذرے جو جہل اور طغیانی کے باعث ماند پڑ گئے تھے پھر چمک اٹھے اور نجد کے چمنستان سے توحید اور کلمہ حق کی ایسی خوشبو پھیلی جس نے تمام عالم کو زعفران زار بنا دیا۔ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے اپنی مسلسل اور انتھک کوششوں سے توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور جہاں تک اس مرد مجاہد کی آواز پہنچ سکتی تھی اس نے حق وصداقت کا پیغام پہنچایا[1]

ملّت اسلامیہ کی پستی اور زبوں حالی اس قدر نمایاں تھی کہ غیر مسلم بھی جب قرن اوّل کے مسلمانوں سے اس کا تقابلی مطالعہ کرتے تھے تو ماتم کرتے تھے چنانچہ اسٹارڈ ایک امریکی اہل قلم اپنی کتاب دی نیو ورلڈ آف اسلام (The new world of Islam.) کے صفحہ ۲۵، ۲۶ پر لکھتا ہے "مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا، تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں، جاہل عوام ان سے بھاگتے تھے اور تعویذ گنڈے اور مالائیں پھنس کر گندے فقیروں اور دیوانے درویشوں پر اعتقاد رکھتے تھے اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے جن کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع ولی کے طور پر کی جاتی تھی کیوں کہ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ خدا کی برتری کے باعث وہ اس کی اطاعت بلاواسطہ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن کی تعلیم نہ صرف پس پشت ڈال دی گئی تھی بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ مقامات مقدسہ بداعمالیوں کا

---

[1] محمد بن عبدالوہابؒ از مولانا مسعود عالم ندویؒ ص۱۱

مرکز بن گئے تھے اور حج جس کو رسول اللہ ﷺ نے فرائض دینی میں داخل کرلیا تھا، بدعات کی وجہ سے حقیر ہوگیا تھا۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر دنیا میں تشریف لاتے تو اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بت پرستی سے بیزاری کا اظہار فرماتے۔ امیر شکیب ارسلانؒ کی رائے میں بڑے سے بڑا دقیق النظر عالم بھی بارہویں صدی کے مسلمانوں کی اس سے زیادہ صحیح اور واضح تصویر نہیں کھینچ سکتا۔[1]

عرب کے قلب نجد کی حالت اور بھی خراب تھی۔ اہل نجد اخلاقی انحطاط میں حد سے گذر چکے تھے۔ سوسائٹی میں بھلائی برائی کا کوئی معیار قائم نہیں رہا تھا۔ مشرکانہ عقیدے بُری طرح دلوں میں گھر کر چکے تھے۔ ایک بڑا طبقہ انہی خرافات کو دین کا صحیح نمونہ جانتا تھا۔ وادی حنیفہ کے مقام جبلیہ میں زیدؓ ابن خطاب کی قبر کی پرستش ہوتی تھی، درعیہ میں بھی بعض قبریں اور قبے جاہلانہ عقیدے کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ وادی غبیرہ میں ضرارؓ ابن ازور کا قبہ بدعتوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جبیدۃ الفداء میں ایک پرانا درخت جوان مرد اور عورتوں کی عقیدت کا مرکز تھا جہاں شرمناک حرکتیں ہوتی تھیں نیز درعیہ میں ایک غار تھا جہاں حد درجہ شرمناک برائیاں ہوتی تھیں۔ اور یہ سب کچھ دین و مذہب کے نام پر ہوتا تھا۔[2]

سیاسی حالت اور بھی خراب تھی۔ خانہ جنگی اور بدحالی عام تھی۔ شمالی نجد (وادی شمر) قبیلہ طے اور حسا میں بنو خالد کا زور تھا۔ عُیینہ کی امارت بھی انھیں کے زیر اثر تھی، درعیہ میں عنزہ کے قدم جم رہے تھے۔ درعیہ کے

---

[1] کتاب مذکور ص ۱۲ [2] کتاب مذکور ص ۱۴

قریب منفوحہ میں دواس کی الگ امارت قائم تھی۔ غرض کہ نجد کا چھوٹا سا علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔

خاندان

اس پُر آشوب دور اور ناموافق ماحول میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نے آنکھیں کھولیں۔ آپ عُیَیْنَہ کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ (۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء) آپ کے جدامجد سلیمان بن علی بن مشرف آپ کے چچا ابراہیم بن سلیمان، چچازاد بھائی عبدالرحمٰن بن ابراہیم آپ کے والد عبدالوہاب بن سلیمان، آپ کے بھائی سلیمان بن عبدالوہاب اور بھتیجے عبدالعزیز بن سلیمان وغیرہ سب کے سب علم وادب اور تقویٰ وورع میں ممتاز اور نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔

بچپن

آپ بچپن ہی سے ذہین اور علم کے شوقین تھے۔ قوتِ حافظہ میں ممتاز تھے۔ دس برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے قرآن مجید حفظ کر لیا۔ فقہ حنبلی اپنے والد شیخ عبدالوہاب سے پڑھی۔ لڑکپن ہی میں حدیث وتفسیر کی کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کیا۔ آپ کے والد اپنے بیٹے کی ذہانت کے قائل تھے اور استعداد پر تعجب کرتے تھے وہ کہتے ہیں کہ محمد کی تدریس وتعلیم کے دوران، میں خود اس کی ذہانت اور وسعت معلومات سے مستفید ہوا۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب تحصیل علم کے اس قدر گرویدہ تھے اور انہماک کا یہ حال تھا کہ ایک ایک نشست میں بیس ۲۰ بیس ۲۰ صفحے لکھ لیتے تھے۔

علمی سفر

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ غیر معمولی حساس دل کے مالک تھے۔ اپنے چاروں طرف نجد کی بستیوں اور آبادیوں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر بے چین ہو جاتے اور ان کی اصلاح وسدھار کے لیے جوش اور ولولہ ان کے دل میں پیدا ہوتا لیکن بے صبری اور عجلت کے بجائے موصوف نے علم وتدبر سے کام لیا پہلے علم کے ہتھیاروں سے مسلح ہو لینا ضروری خیال کیا۔ نجد کے علمائیں

آپ کے والد کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ آپ نے اپنے والد سے پورا استفادہ کیا لیکن تجدید اور اصلاح کے لیے ابھی مزید علم درکار تھا۔ چنانچہ آپ نے حجاز کا رُخ کیا اور تحصیل علم میں انہماک کے ساتھ لگ گئے۔ عبداللہ بن ابراہیم مجمعی، شیخ محمد حیات سندھی اور محمد بن سلیمان کردی جیسے علماء اور ماہرین قرآن وسنت سے جو مدینہ منورہ میں مقیم اور مشہور تھے علم حاصل کیا۔ مدینہ منورہ سے شیخ نے بصرہ کا قصد کیا اور وہاں شیخ محمد مجموعی سے حدیث ولغت کا درس لیا۔ غرض کہ شیخ نے نجد، حجاز اور عراق کے علماء سے خوب خوب استفادہ کیا حتیٰ کہ خود دریائے علم کے غواص بن گئے اور علامہ کا مقام حاصل کرلیا۔

دعوت وتبلیغ شیخ محمد عبدالوہاب زمانہ طالب علمی ہی سے معروف کا امر کرنے اور منکر سے نہی کرنے کی اہمیت محسوس کرتے تھے بلکہ عملاً اس فریضہ کو ادا کرنے کی کوشش بھی فرماتے تھے۔ چنانچہ ابھی وہ عیینہ میں فقہ وحدیث کی ابتدائی تعلیم حاصل کررہے تھے کہ بدعات ان کی آنکھوں کھٹکنے لگیں وہ شریعت کی خلاف ورزی ہوتی دیکھتے تو دل ہی دل میں کڑھتے اور بے چین ہو جاتے۔ پھر جب مدینہ منورہ میں علامہ محمد حیات سندھی اور شیخ علی بن ابراہیم سے مستفید ہوئے اور احادیث پر نظر پیدا ہوئی اور دنیائے اسلام پر نگاہ ڈالی تو انھیں ملّت اسلامیہ گمراہی کی چادر میں لپٹی نظر آئی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پاک کے پاس جاہلوں کی حرکتیں دیکھتے تو انھیں دکھ ہوتا حتیٰ کہ انھوں نے بدعات کے خلاف اسی زمانہ میں آواز بلند کی۔ تعلیم ہی کے سلسلہ میں جب بصرہ پہنچے تو امر بالمعروف اور خصوصاً نہی عن المنکر کا جذبہ اور تیز ہوگیا جس کے سبب شیخ کو مصائب جھیلنا پڑے۔ بصرہ سے آپ کو نکلنا پڑا۔ ٹھیک دوپہر کے وقت آپ کو بصرہ چھوڑنا پڑا۔

آپ پیدل زبیر نامی بستی کی طرف چل پڑے۔ راستہ میں پیاس کی وجہ سے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ آخر اللہ کی مدد شامل حال ہوئی۔ ابو حمید نامی ایک باخدا انسان کو آپ پر ترس آیا۔ اس شخص نے شیخ کو پانی پلایا اور سواری کا انتظام کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر شیخ حریملا واپس آ گئے۔ یہاں آپ نے بدعات کا استیصال اور توحید و اخلاق کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ آپ نے اپنی دعوت کی بنیاد توحید کو قرار دیا۔ عبادت خواہ کسی شکل میں ہو۔ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص کرنے پر زور دیا۔ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا اور لا الٰہ الا اللہ کا اعلان و دعوت آپ کا شعار تھا۔ صدیوں کے بگڑے ہوئے اخلاق کو درست کرنا، قرنوں سے گندگیوں میں لت پت معاشرہ کی اصلاح کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ چوروں سے چوری، ڈکیتی اور لوٹ مار اور مکر و فریب کی بری عادتیں چھڑا کر ان میں راست بازی، شرافت اور ہمدردی کی صفات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جاہلوں کے غلط عقیدوں کی اصلاح اور قبر پرستی سے ہٹا کر خالص خدا پرستی پر انھیں لگانا کسی معمولی انسان کے بس کا کام نہ تھا۔ اس کے لیے خلوص و للّٰہیت، صبر و استقامت اور عزیمت کی صفات درکار تھیں۔ شیخ ان خوبیوں سے مالا مال تھے، چنانچہ جب آپ نے توحید کی دعوت دی، غیر اللہ کے سامنے جھکنے، قبروں اور ولیوں سے مدد مانگنے اور صالح بندوں اور بزرگوں کو معبود بنانے سے روکنے کی کوشش کی اور زیارت قبور کے سلسلہ میں مسنون طریقے کے خلاف جو بدعتیں رائج ہو گئی تھیں انھیں مٹانے کے لیے عملاً قدم اٹھایا، پھر کیا تھا، مخالفت کا سیلاب امڈ آیا، مصائب کا پہاڑ پھٹ پڑا، عناد اور دشمنوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

حصولِ اقتدار کی کوشش

اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے

جس قدر دعوت و تبلیغ ضروری ہے، اسی قدر غلبہ و اقتدار اور حکومت و سلطنت کی طاقت کا حصول بھی ضروری ہے۔ حضورؐ نے دعا فرمائی تھی، اے اللہ! عمرو بن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے تو جسے پسند فرمائے اسے ایمان و اسلام کی توفیق عطا فرما کر اسلام کو عزت عطا فرما۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں، مَا زِلْنَا أَعِزَّةً مُنْذُ أَسْلَمَ عُمَرُ، عمر بن خطابؓ نے جب سے اسلام قبول کیا ہم بالادست ہو گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ حضورؐ نے اقتدار و حکومت کا اولین موقع حاصل ہوتے ہی اس کو ہاتھ میں لیا بلکہ مکہ ہی میں سیاسی معاہدے کرنا شروع فرما دیئے تھے۔ اور کیوں نہ فرماتے جب کہ قوت ید یعنی مادّی طاقت کے ذریعہ منکرات کا مٹانا فرض ہے تو اس کا حصول آخر ضروری کیوں نہ ہوگا؟ خلفاء راشدینؓ کا سب سے اہم کارنامہ یہی ہے۔ انھوں نے حکومت و سیاست کو محفوظ و مستحکم کیا بلکہ وسعت دی اور پروان چڑھایا اور سلطنت کی عظیم طاقت سے اعلاء کلمۃ اللہ کا کام اور اقامت دین کی خدمت لی۔

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے بھی ضروری سمجھا کہ جب تک چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم رہیں گی شیوخ اور سرداران قبائل الگ الگ با اقتدار باقی رہیں گے اور من مانیاں کرتے رہیں گے تب تک دعوت و تبلیغ اور احیاء دین کی کوششیں کچھ زیادہ بار آور نہیں ہو سکتیں۔ کسی نہ کسی ریاست کے امیر کو اپنے ساتھ لے کر دینی بنیاد پر ایک بڑی ریاست قائم کرنے کی کوشش ناگزیر ہے۔ لہذا شیخ نے عثمان بن معمر عیینہ سے خط و کتابت کی اور جب امیر کو آمادہ پایا تو خود بھی عیینہ منتقل ہو گئے۔ امیر نے شیخ کو سر پر بٹھایا۔ امیر کی بھتیجی جوہرہ بنت عبداللہ بن معمر سے شیخ کی شادی ہوئی۔ شیخ نے امیر کے سامنے دعوت دو ٹوک الفاظ میں رکھی، توحید کا صحیح مفہوم سمجھایا اور اس عظیم کام میں امداد و تعاون کی استدعا کی

شیخ کے یہ الفاظ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں ۔

إِنِّيْ أَرْجُوْا إِنْ أَنْتَ قُمْتَ بِنَصْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ أَنْ يُّظْهِرَكَ اللّٰهُ تَعَالیٰ وَتَمْلِكَ نَجْدَ وَأَعْرَابَهَا۔

اگر آپ لا الٰہ الا اللہ کی امداد کرنے اٹھ کھڑے ہوں تو اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ آپ کو غالب کرے گا اور نجد اور اہلِ نجد کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں آجائے گی۔

امیر نے امداد کا وعدہ کیا اور شیخ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت کھلم کھلا دینا شروع کر دی، اور رفتہ رفتہ اہل عُیینہ کے دل قبولِ حق کی طرف مائل ہونے لگے۔ شیخ نے امیر کی امداد و تعاون سے بدعات کے بعض اڈوں کو مسمار کیا جو درختوں اور قبروں کی شکل میں تھے۔ عوام تو عوام خواص نے بھی انھیں معبود بنا لیا تھا۔ ہر شخص خیال کرتا تھا کہ جس نے ان کو ہاتھ لگایا وہ تباہ ہو جائے گا۔ شیخ نے اپنے ہاتھ سے شرک و بدعت کے ان نشانات کو مٹایا اور جب شیخ پر کوئی بلائے آسمانی اور آفت ناگہانی نہ آئی تب لوگوں کی آنکھیں کھلیں کہ واقعی یہ سب ڈھونگ ہے۔ کوئی خدائی طاقت ان درختوں، قبروں اور قبوں کو حاصل نہ تھی —— شیخ نے عُیینہ کے حاکم عثمان کو نماز باجماعت کے احیاء کی بھی تاکید کی اور اس سلسلہ میں سستی، غفلت اور ٹال مٹول کرنے والوں کے لیے سزائیں تجویز کیں —— حکام طرح طرح کے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ شیخ نے تمام ناجائز اور ظالمانہ ٹیکس منسوخ کرائے اور زکوٰۃ کی وصولیابی اور صرف کا نظم قائم کرایا۔ لیکن شیخ کے مخالفین ان کارناموں میں بھی حرف گیری سے باز نہ آئے۔ عُیینہ ہی سے شیخ نے تبلیغی رسالوں کا سلسلہ جاری کیا جو مرتے دم تک جاری رہا۔ نہ صرف یہ بلکہ شیخ نے حدود شرعیہ بھی نافذ کرائیں اور یہی

کارنامہ عیینہ سے آپ کے اخراج کا سبب بن گیا۔

آزمائش عُیینہ میں کامیابی قدم چوم رہی تھی۔ اصلاح و دعوت کا کام برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ حاکم عیینہ آپ کا معاون اور ہمنوا تھا۔ اور اقامت صلوٰۃ اور نظم زکوٰۃ سے آگے بڑھ کر نفاذِ قانونِ اسلامی تک قدم بڑھ چکا تھا کہ بظاہر ایک شر پیدا ہوا جس میں ہزاروں برکتیں پوشیدہ تھیں۔ ہونے والی یہ بات کہ ایک شادی شدہ عورت گناہ میں مبتلا ہوئی۔ اس نے شیخ کے سامنے اعتراف کیا اور بار بار کی جرح سے بھی وہ اپنے اقرار سے نہ پھری۔ شیخ نے مجبوراً اس کے سنگسار کیے جانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ عورت کو مجمع عام میں سنگسار کر دیا گیا۔ سب سے پہلا پتھر خود حاکم عیینہ امیر عثمان نے مارا۔ اس واقعہ نے چاروں طرف تہلکہ مچا دیا۔ خصوصیت سے ان حلقوں میں جو بدکاریوں میں مبتلا تھے کھلبلی پڑ گئی۔ احسار اور قطیف کے حاکم سلیمان بن محمد کے دربار میں بات پہنچائی گئی اور بڑھا چڑھا کر رنگ آمیزی کے ساتھ پہنچائی گئی اور اسے شیخ کی مخالفت پر اُبھارا اور آمادہ کیا گیا۔ یہ شخص انتہائی رنگیلا اور آوازہ مزاج تھا۔ رجم کے واقعہ سے وہ برہم ہو گیا اور امیر عیینہ کو تہدید آمیز خط لکھا کہ شیخ کو قتل کر دو ورنہ تمہاری امداد جو ہم کرتے ہیں بند کر دی جائے گی۔ بارہ سو دینار سالانہ کی رقم بند ہونے کے اندیشے سے عثمان امیر عُیینہ خوف زدہ ہو گیا اور شیخ کو حاکم احسار کے خط سے مطلع کیا۔ شیخ نے امیر عیینہ کو ہزار سمجھایا اور تسلی دینے کی کوشش کی لیکن زوال دنیا کا خوف جب چھا جاتا ہے تو کوئی فہمائش کام نہیں کرتی۔ آخر اس نے شیخ کو اپنے علاقے سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ ایک سپاہی فرید نامی گھوڑے پر سوار پیچھے پیچھے چل رہا ہے اور شیخ پیدل آگے آگے ریگستان عرب کی چلچلاتی دھوپ اور تپتا ہوا ریت، کیا حالت

ہوئی ہوگی، رونگٹے کھڑے ہوتے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ شیخ یہ آیت پڑھتے ہوئے عیینہ کی حدود سے باہر نکل گئے۔

مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔

جو شخص اللہ سے تقویٰ کی روش اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کے لیے نکلنے کی راہ پیدا فرما دیتا ہے اور جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا وہاں سے رزق عطا فرماتا ہے۔

شیخ عیینہ کی حدود سے نکل کر درعیہ تشریف لے گئے، درعیہ کے حاکم امیر محمد بن سعود اور اس کے بھائیوں نے شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آخر آپ کی دعوت کو قبول عام حاصل ہوا اور آل سعود کے تعاون سے شیخ نے اسلامی انقلاب برپا کیا۔ انفرادی زندگیاں سدھر گئیں، معاشرہ اصلاح پذیر ہوگیا اور احکام اسلامی بھی نافذ اور جاری ہوئے۔

شیخ کی دعوت

شیخ محمد ابن عبدالوہابؒ کی دعوت کا خلاصہ اگر بیان کیا جائے تو اس کے مندرجہ ذیل نکات ہوں گے۔

- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی ان تمام بھلائیوں کا حکم دینا جن کو اسلام بھلائی قرار دیتا ہے اور ان تمام برائیوں سے باز رکھنا جن کو اسلام برائی اور منکر قرار دیتا ہے۔
- بدعات کی بیخ کنی اور سنّت کا احیا، یعنی زندگی کے تمام معاملات میں عقائد و عبادات اور اخلاق سے لے کر معاشرت اور معیشت اور سیاست تک میں دین کے نام سے جو بے دینی گھس آئی تھی اسے اکھاڑ پھینکنا اور جنابِ نبی کریمؐ کی سنت اور شریعت اسلامی کو فکر و عمل دونوں میں جاری کرنا۔

• آپ کی دعوت کی اصل بنیاد توحید ہے اور لا الٰہ الا اللہ کی دعوت ہے۔ اللہ کے کلمہ کو بلند اور طاغوت کے کلمہ کو پست کرنا وہ اساس ہے جس پر آپ کی دعوت کی بنیاد تھی۔ آپ کا پیغام تھا کہ عبادت خواہ کسی قسم کی ہو کسی شکل میں ہو وہ پوجا پاٹ پرستش ہو یا بندگی اور غلامی یا اطاعت و فرماں برداری سب اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

• قبر پرستی، قبہ پرستی، شجر پرستی سے ہٹا کر صرف خدا پرستی آپ کا مشن تھا۔ غیر اللہ کے آگے جھکنا، قبروں اور ولیوں سے مدد مانگنا، فریاد چاہنا، منتیں مرادیں مانگنا، صالح بندوں اور بزرگ انسانوں کو معبود بنانا وغیرہ وہ مشرکانہ عقائد اور اعمال تھے جن کی بیخ کنی کا شیخ نے بیڑا اٹھایا تھا۔

• شیخ ہر شعبۂ زندگی میں اسلام کا غلبہ چاہتے تھے۔ آپ کا مشن وہی تھا جو ایک مومن کا ہونا چاہیے۔ وہ سیاست و اجتماعیت اور حکومت و سلطنت کے شعبوں میں بھی اسلام کا غلبہ چاہتے تھے۔

غرض کہ شیخ کے پیش نظر اول اور آخر اسلام اور صرف اسلام تھا وہ ہمہ پہلو سنت اور دین کا غلبہ اور احیاء چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی سے بھی ہمکنار کیا۔ اللہ ان کو اپنی بے کراں رحمتوں سے نوازے۔ آمین۔

مخالفت کے اسباب

باطل پرستوں کو حق کا غلبہ اور نفس پرستوں کو خدا پرستی کا بول بالا کب گوارا ہوتا ہے۔ ایسے تمام طبقے ہمیشہ حق اور اہل حق کی مخالفت کا بیڑا اٹھاتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایسے تمام لوگ ہاتھ دھو کر شیخ کے پیچھے پڑ گئے۔

• دشمنانِ اسلام مسلمانوں کی ایسی تحریک کو اپنے لیے ہمیشہ خطرہ سمجھتے رہے ہیں جو جہاد کی قوتوں اور اجتہاد کی طاقتوں سے کام لے کر اسلام کو غالب

کرنے کے لیے چلائی گئی ہو چنانچہ مغربی مفکرین خصوصاً انگریز، سیاست اور پروپگنڈہ کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ہر ایسی تحریک کے استیصال میں آگے آگے رہے ہیں۔ شیخ کی تحریک کو بھی ان لوگوں نے مسلمانوں میں بدنام کیا بلکہ محمد علی پاشا اور ابراہیم پاشا کے ذریعہ اپنی دانست میں نیست و نابود کر کے چھوڑا۔ جاہل مولویوں اور صوفیوں کو ابھار دیا اور دنیا کا لالچ دے کر پیچھے لگا دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں جو اجتہاد کی قوتوں سے مالا مال اسلامی تحریکیں اٹھیں، ان کو وہابیت کا نام دے کر مسلمانوں میں نامقبول بنانے کی کوششیں کی گئیں اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اللہ مسلمانوں کو فراستِ مومنانہ عطا فرمائے۔ آمین۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

ایک عظیم مجاہد اور مجدّد

۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۸ء ـــــ ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء

شاہ شہیدؒ اور سید شہیدؒ نے جس زمانے میں اصلاحِ ملت اور تجدیدِ دین کا بیڑا اٹھایا اور جہاد کا علم بلند کیا، اس کا پس منظر جب تک نگاہوں کے سامنے نہ ہو آپ کے کارناموں کا اور آپ کی عظیم تحریک کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوا۔ آپ کی وفات سے اسلامیانِ ہند کا سیاسی زوال شروع ہو گیا۔ عالمگیرؒ جیسے عظیم حکمران کی اولاد، حکمرانی کی صلاحیتوں سے قطعاً محروم تھی۔ سلاطین انتہائی نااہل اور نالائق تھے تو حکام ان سے پیچھے کیوں رہتے۔ وہ باہمی رقابت اور آویزش کا شکار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ امراء کاہل اور عمّال ظالم ہو گئے۔ راجپوتوں، جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ اس صورتِ حال سے صوبے دار کیوں نہ فائدہ اٹھاتے۔ دکن، گجرات، بنگال، ملتان، اودھ اور مالوہ سب خود مختار بن بیٹھے۔ نادر شاہ درانی آیا، آسمانی کوڑا بن کر برسا، خون کے ندی نالے بہائے، مگر مسلمانوں کو پھر بھی

ہوش نہ آیا۔ محمد شاہ نے پہلے سے زیادہ رنگ رلیاں منائیں۔ پانی پت کی تیسری لڑائی (۱۷۶۱ء) نے اگرچہ مرہٹہ حکومت کا خواب ہمیشہ کے لیے پریشان کردیا لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مرکزی حکومت کا بھی گویا دیوالہ نکل گیا۔ سورج مل جاٹ نے دن دھاڑے اکبر آباد کو لوٹا اور تباہ کیا۔ سب جا چکا تھا اور "حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم" کا منظر سامنے تھا۔ پھر بھی بادشاہ سلامت کی ظاہری آنکھیں باقی تھیں۔ غلام قادر روہیلا نے سوچا جب ان سے کام نہیں لیا جاتا تو ان کو باقی رہنے کا بھی حق نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں۔ ۱۷۵۷ء میں میر جعفر کی نمک حلالی کی بدولت بادشاہ کو بھی دہلی چھوڑ کر انگریزوں کے سایہ عاطفت میں رہنے کے لیے الٰہ آباد جانا پڑا۔ ۱۷۹۹ء میں وقت کے ایک مجاہد نے اسلام، ملت اسلام اور وطن المسلمین کی آزادی، سربلندی اور غلبہ و تسلط کے لیے آخری کوشش کی مگر میر جعفر کی روح، میر صادق نے پھر نمک حلالی کا ثبوت دیا۔ ٹیپو سلطان نے شہادت کا جام نوش کیا اور انگریزوں کے قدم ۱۹۴۷ء تک کے لیے جم گئے۔ عارف سیالکوٹی نے سچ کہا ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ دنیا، ننگِ دیں، ننگِ وطن

۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی فتح کر کے مسلمانوں کی سیاسی بالاتری کا خاتمہ کردیا ـــــ یہ تھا اٹھارویں صدی میں اسلامیان ہند کی سیاسی حالت کا اجمالی خاکہ۔ مذہبی حالت بھی دگرگوں تھی۔ ہندوستان میں اسلام یا تو اپنی ذاتی کشش اور فطری جاذبیت کی بناء پر پھیلا، مسلم تاجروں کی بدولت پھیلا، یا صوفیائے کرام کی روحانیت اس کا ذریعہ بنی۔ بعض مسلمانوں کی انفرادی

کوششوں سے بھی اس نے فروغ پایا لیکن غلاموں، خلجیوں، تغلقوں، سیدوں، لودھیوں، ترکوں اور مغلوں کی حکومت نے اسلام کی اشاعت کے لیے دانستہ کوئی کوشش نہیں کی۔ اگر جائز تبلیغی کوششیں کی گئی ہوتیں تو صدیوں کی مدت میں اس کا یہ نتیجہ ضرور سامنے آتا کہ ہندوستان یقیناً مسلم اکثریت کا ملک ہوتا، بلکہ ممکن تھا کہ تمام مسلم ممالک کی رہنمائی اور قیادت کا منصب بھی اس کو حاصل ہوتا لیکن اے غفلت اور بے حسی تیرا برا ہو کہ نا فرض شناس حکمرانوں نے اس طرف قطعاً توجہ نہیں کی۔ لے دے کر صرف فیروز شاہ تغلقؒ، اورنگ زیبؒ، سلطان محمودؒ بیگڑہ والی گجرات اور سلطان ٹیپو شہیدؒ نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے کچھ نہ کچھ سرگرمی کا ثبوت دیا اور بس اللہ اللہ خیر سلّا —— لیکن باقاعدہ اسلامی تعلیم و تربیت کا نظام نہ ہونے کی وجہ سے نومسلموں کی دینی تعلیم و تربیت نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو مرد اور خصوصاً عورتیں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں وہ غیر اسلامی رسوم ورواج، عقائد، توہمات اور خیالات اپنے ساتھ لیتی آئیں، جو آج تک مسلم معاشرہ کا جزء لاینفک بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح بعض حکمرانوں نے ہندو عورتوں سے شادی کا کافرانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی ابتداء کی۔ یہ "دیویاں" جب آئیں تو مشرکانہ خیالات اور رسوم بھی اپنے ساتھ لائیں جو رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تمدنی زندگی میں داخل ہو گئے۔ آج بھی عام مسلمان عورتوں کی مذہبی زندگی میں ان ہی عقائد و رسوم کا غلبہ نظر آتا ہے۔ بہر حال اٹھارویں صدی عیسوی میں مسلمانوں میں آثار پرستی، قبر پرستی، جھاڑ پھونک، ٹونہ ٹوٹکا، گنڈہ تعویذ، بھوت پریت، مشرکانہ رسوم اور عقائد پائے جاتے تھے۔ حالانکہ قرآن و حدیث میں ان چیزوں کی تعلیم نہیں ہے۔ البتہ مجددین ان چیزوں کے

متعلق منتشر ضرور موجود ہیں ـــــ مسلمانوں کی مجلسی اور تمدنی حالت بھی یوں ہی تھی۔ برسرِ اقتدار اور سر برآوردہ طبقہ عیش و عشرت میں غرق تھا اور "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" پر عامل تھا۔ عام مسلمان بھی انھیں کے پیچھے ہو لیے تھے۔ عیش و عشرت اور عیاشی کے فنونِ لطیفہ کا تو زور تھا ہی، فنونِ کثیفہ کا بھی چلن عام تھا۔ شاعری اور موسیقی کے علاوہ مُرغ بازی، بٹیر بازی، تیتر بازی، پتنگ بازی، تاش، گنجفہ، چوسر اور شطرنج ـــــ اور ـــــ قمار بازی، شراب خواری، گویا مسلم معاشرہ کا جز بن چکی تھی۔ عام لوگ نہیں بلکہ شرفاء میں یہ چیزیں عام تھیں اور وہ ان عیوب کو عیب نہیں، ہنر شمار کرتے تھے، اور اس ہنرمندی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے تھے۔ یوں سمجھیے مسلمان ہر پہلو سے مر چکے تھے یا سسک رہے تھے اور دم توڑ رہے تھے۔ ان کا دورِ شمشیر و سناں گذر چکا تھا۔ اب ان کا دور طاؤس و رباب تھا۔

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے؟
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

جہالت عام تھی۔ عورتیں تو پھر عورتیں ہیں، عام مسلمان مرد بھی لکھنے پڑھنے سے نابلد تھے۔ عام علماء بھی منطق اور فلسفہ کی فرسودہ بحثوں میں وقت ضائع کرنے اور فقہی جزئیات کے بل بوتے پر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے یا ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں مشغول تھے۔ قرآن اور حدیث گویا ان کے نصاب میں داخل ہی نہ تھا۔ اسلامی تصوف میں ویدانت اور اپنشد کے اصول و نظریات شامل بلکہ غالب ہو چکے تھے۔ دنیا پرست صوفی قبروں اور مزاروں اور عرسوں کے ذریعہ استحصال میں مگن تھے ـــــ یہ حالات[1] تھے جب

---

[1] ماخوذ از مضمون "شاہ شہیدؒ" از مولانا یوسف سلیم چشتی۔

شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان نے اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔

تعلیم و تربیت شاہ شہیدؒ کا نام شاہ محمد اسمٰعیل ہے۔ آپ کے والد کا نام شاہ عبد الغنی ہے۔ آپ کے دادا کا نام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہے۔ آپ کے پر دادا کا نام شاہ عبد الرحیم ہے۔ آپ کے ایک چچا شاہ عبد القادر صاحبؒ ہیں، دوسرے چچا شاہ عبد العزیزؒ محدث دہلویؒ ہیں، تیسرے چچا شاہ رفیع الدین صاحبؒ ہیں ——

اللہ اللہ! ایں خانہ ہمہ آفتاب است

کس قدر خوش نصیب اور بخت آور ہے وہ ہونہار بچہ جو ایسے خاندان کا چشم و چراغ ہو۔ شاہ شہیدؒ کا خاندان علم و فضل اور تقویٰ و طہارت، اخلاق و رو حانیت شریعت اور دیانت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ آپ نے آنکھ کھولی تو گھر میں اللہ اور رسولؐ کے چرچے سنے، اخلاق اور شائستگی کا نمونہ دیکھا، اعلیٰ اخلاق کی مالک اور بلند سیرت کی حامل گودوں میں کھیلے اور پروان چڑھے۔ بڑے ہوئے تو اپنے چچا شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا۔ علوم ظاہری اور علوم باطنی دونوں میں کمال حاصل کیا۔ مشیت ایزدی، توارث، ذہانت، تربیت اور خاندانی ماحول نے آپ کو اعلیٰ بنانے میں مدد کی اور آپ بہترین اوصاف کے مالک بن گئے۔

آپ نے آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ ختم کر لیا۔ حفظ کے ساتھ کسی قدر اس کے فہم اور ترجمے سے بھی آپ کو واقفیت بہم پہنچائی گئی۔ چنانچہ آپ اپنے ہم عمروں سے بات بات میں یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ قرآن مجید میں تو یہ لکھا ہے اور تم یہ کرتے ہو۔؟

ابھی آپ کی عمر گیارہ بارہ سال ہی کی تھی کہ علم صرف و نحو میں آپ نے

خاصا ملکہ پیدا کر لیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے معقولات کی طرف توجہ فرمائی چنانچہ ۱۲ سال کی عمر میں آپ نے "صدرا" جو انتہائی مشکل کتاب شمار ہوتی ہے خصوصاً اس میں اقلیدس کا پانچواں مقالہ لیکن آپ جیسے ذہین اور طباع کے لیے وہ کچھ مشکل ثابت نہ ہوئی۔ آپ عموماً مشکل مقامات بھی استاد کی مدد کے بغیر خود ہی حل کر لیتے اور بعض اوقات شارحین کی شرحوں اور حاشیہ نگاروں کے حاشیوں پر اعتراض بھی کیا کرتے تھے۔ آپ کے ہم سبق آپ سے زیادہ عمر کے طلبار آپ کی ذہانت اور طباعی پر انگشت بدنداں رہتے بلکہ رشک و حسد کی آگ میں جلا کرتے تھے۔ منطق اور ریاضی وغیرہ علوم عقلیہ سے فارغ ہو کر آپ نے احادیث کی طرف توجہ فرمائی اور اپنے چچا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ سے علم حدیث میں مہارت پیدا کی۔ مولوی کرامت علی صاحب حیدرآبادی آپ کے ہم سبق تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ہم لوگوں نے شاہ صاحب سے شکایت کی کہ محمد اسمٰعیل رات دن تیراندازی، شہسواری اور گولی چلا کر نشانہ بازی سیکھنے میں لگے رہتے ہیں۔ نہ پڑھنے سے پہلے مطالعہ کرتے ہیں اور نہ پڑھنے کے بعد کتاب اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ ہماری شکایت پر شاہ صاحب نے امتحان لیا تو وہ ہم لوگوں سے اچھے ثابت ہوئے۔ ذہانت اور حافظہ اللہ کی خاص بخششیں ہیں جن سے اللہ نے آپ کو خوب خوب نوازا تھا۔ چنانچہ ۱۶ برس کی عمر میں آپ معقولات اور منقولات کے فاضل اور فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ ریاضی، جغرافیہ، تاریخ اور دینی علوم سے آپ کو خصوصی لگاؤ تھا اور خاص دلچسپی تھی بلکہ یوں سمجھیے کہ یہ آپ کے خاص مضامین تھے۔ آپ نے ان علوم میں اختصاصی درجہ حاصل کیا۔

مجاہدانہ ورزشیں دین اور سلطنت کے ضعف سے مسلمانوں میں بھی ضعف روز افزوں ترقی پر تھا۔ فنون لطیفہ، ناچ رنگ، گانا بجانا

وغیرہ اور فنونِ کثیفہ تیتر اور بٹیر بازی وغیرہ میں انہماک بڑھ رہا تھا۔ حربی فنون اور سپاہیانہ کھیلوں کی طرف سے غفلت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اب مسلمانوں میں شہسواری، نیزہ بازی، تلوار بازی، تلوار سے نیبو کاٹنا، مینخیں اکھاڑنا، گولی چلانا، شیر کا شکار کھیلنا کم ہوتا جا رہا تھا۔ پھر بھی دہلی کے ہر محلے میں اکھاڑے موجود تھے جن میں لڑنت، کشتی، پٹہ بازی اور بنوٹ وغیرہ کی مشق کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن شرفا خصوصاً امراء اور علماء ان سے پرہیز کرتے تھے بلکہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔

مولانا شہیدؒ جب کتابی علم سے فارغ ہوئے اور آپ نے سوسائٹی میں قدم رکھا تو آپ نے سپاہیانہ فنون میں تکمیل بہم پہنچانے کی شدید ضرورت محسوس کی۔ آپ نے مولویانہ طرزِ معاشرت اور شیخانہ شان کے مقابلے میں عمر فاروقؓ، خالد بن ولیدؓ، ابو عبیدہؓ اور سعد بن وقاصؓ کا جانشین بننا پسند فرمایا۔ سب سے پہلے آپ نے گھوڑے کی سواری میاں رحیم بخش چابک سوار سے سیکھی اور اس میں اس قدر مشق بہم پہنچائی کہ خواہ کتنا ہی چلبلا، منہ زور اور سرکش گھوڑا ہوتا پھر بھی زین اور رکاب کے بغیر اس پر سوار ہو جاتے اور دوڑا لیتے تھے۔ حتیٰ کہ چالیس چالیس میل تک شہسواری کے جوہر دکھانے کے بعد بھی تھکتے نہیں تھے۔ شہسواری کے بعد آپ نے پٹہ بازی اور بنوٹ مرزا رحمت اللہ بیگ سے سیکھی اور جلد ہی ان چیزوں میں بھی کمال پیدا کر لیا۔ آپ نے مہینوں چتلی قبر، حویلی اعظم خاں کے اکھاڑے میں کشتی اور لڑنت کا فن سیکھا اور اس میں مشق اور مہارت پیدا کی ہے۔ مغل شہزادے آپ کی ان کوششوں اور دلچسپیوں کو دیکھ کر ہنسے اور حقارت آمیز نگاہیں آپ پر ڈالیں کہ یہ مولوی زادہ سپاہیانہ ورزشیں اور مجاہدانہ مشقیں کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا، میں

ان کی اولاد میں ہوں جنھوں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو زیر کیا تھا اور تم ان کی اولاد ہو جنھوں نے اپنی عیش و عشرت اور رنگ رلیوں کی خاطر ملّتِ اسلامیہ کا وہ حال کر دیا ہے جو آج نظروں کے سامنے ہے۔

گولی چلانے اور نشانہ مارنے میں بھی آپ نے استادانہ مہارت پیدا کی تھی۔ ایک روز فرمانے لگے یہ ناممکن ہے کہ جانور میرے سامنے آئے اور بچ کر نکل جائے۔ ایک ساتھی نے ہنس کر کہا اگر اس کی موت ہی نہ آئی ہو؟ فرمایا تو وہ میرے سامنے آئے گا ہی کیوں؟ اس کے بعد مولانا نے تیرنا سیکھا، اور اس فن میں اس قدر کمال پیدا کیا کہ اچھے اچھے پیراک آپ سے مقابلہ نہ کر سکے۔ پیراکی میں مہارت کے بعد آپ نے دوڑنے کی مشق بہم پہنچائی۔ حتیٰ کہ ایک سانس میں کئی کئی میل دوڑ لیتے تھے۔ آپ نے چلچلاتی دھوپ میں تپتی ریت، جلتی سڑک پر خراماں ننگے پیر گھنٹوں چلنے کی بھی عادت ڈالی۔ ابتدا میں آپ کے پیروں میں چھالے پڑ گئے لیکن آپ مشق کرتے رہے۔ آخر جامع مسجد دہلی کے صحن میں سُرخ پتھر پر کئی کئی گھنٹے چلنے کی عادت ہو گئی تھی۔ کم سونے کی بلکہ کئی کئی راتیں جاگنے کی ریاضت بھی آپ نے کی اور اس میں بھی کامیاب رہے۔ اپنی نیند اور بیداری پر مولانا کو پورا پورا قابو تھا۔ جب چاہتے سو جاتے اور جب چاہتے بیدار ہو جاتے۔

درس اور وعظ

آپ نے اپنے اُستاد اور چچا شاہ عبدالعزیز رح کے بعد ان کی مسندِ درس کو زینت بخشی اور وعظ کہنے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ درس کے ذریعہ جہالت، بدعات اور مشرکانہ رسوم و رواج میں ڈوبی ہوئی ملّت کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ کیا عوام اور کیا خواص، کیا پست اور کیا بلند ہر طبقہ کی اصلاح کی فکر کی۔

فکر و ذہن اور عقائد میں جو غیر اسلامی خیالات گھس آئے تھے، اخلاق و عادات میں جو غیر اسلامی چیزیں داخل ہو گئی تھیں، معاملات اور برتاؤ میں جو برائیاں شامل ہو گئی تھیں، عبادات اور دیانت میں جو گمراہیاں در آئی تھیں، غرض کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ایک ایک بُرائی اور خرابی پر آپ نے ٹوکا، جھنجھوڑا۔ جن لوگوں میں ایمان کی چنگاری باقی تھی وہ بھڑک اٹھی اور انھوں نے اپنی حالت سدھار لی۔

عقائد، اخلاق اور معاشرت میں خاصی اصلاح کرنے میں آپ کامیاب ہوئے۔ حتیٰ کہ طوائفوں کو بھی آپ نے وعظ سنایا اور ان میں سے بھی جو ایمان والیاں تھیں انھوں نے توبہ کی اور بقیہ زندگی پاکیزہ گذاری۔

جہاد اور شہادت سید احمد شہیدؒ کی امارت میں جو عظیم جہاد کیا گیا اس میں تقریباً ایک درجن معرکے ہوئے اور ہر ایک میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، بلکہ سپہ سالاری کے فرائض بھی انجام دیے۔ علی میاں لکھتے ہیں :۔

شاہ اسمٰعیل صاحبؒ کی حالت ہی دوسری تھی۔ برسوں کے ارمان نکلنے کا وقت آیا تھا۔ آپ نے اپنی مردانگی، خارق عادت، شجاعت اور حرارتِ ایمانی کے آخری جوہر دکھائے اور آخر اپنا سر دے کر اپنا بوجھ اتار دیا جو آپ کو اس وقت بے بوجھ معلوم ہو رہا تھا جب سے کہ آپ نے جہاد و شہادت کے فضائل پڑھے تھے اور اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ مولانا آگے لکھتے ہیں :۔

بالاکوٹ کی زمین چند مذہبی دیوانوں ہی کا مقتل نہیں، بلکہ بہت سے سیاسی ہوشمندوں کی بھی عبرت گاہ ہے اور سارے ہندوستان کے لیے یکساں احترام کی مستحق ہے۔ آج بھی وہاں کی وادی ہندوستان کو پیغام سناتی ہے۔

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا!
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

کارنامے آپ کے کارنامے دو قسم کے ہیں۔ ایک علمی کارنامے اور وہ شاہ ولی اللہؒ کے کارناموں کے پرتو ہیں۔ دوسرے عملی کارنامے اور وہ وہی ہیں جو سید احمد شہیدؒ کے کارنامے ہیں۔ مثلاً

(۱) آپ نے تالیف و تصنیف کے ذریعے اسلامی تعلیمات کو نکھار کر پیش کیا۔

(۲) درس و تدریس کے ذریعہ موجودہ نسل کے لیے علماء تیار کیے اور آئندہ نسل کے لیے علمی سرچشمہ جاری کیا۔

(۳) شرک و بدعت اور غیر اسلامی رسوم و رواج کے خلاف قلم اور زبان سے جہاد کیا۔

(۴) اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے جہاد بالسیف کیا اور تھوڑے عرصہ ہی کے لیے سہی، صحابۂ کرام رضؓ کے دور کی یاد تازہ کر دی۔

(۵) سید احمد شہیدؒ کی تحریک کو علمی و فکری غذا فراہم کی۔ دورے کر کے اسے تقویت پہنچائی۔ ولی اللہی خانوادے کے اثر و رسوخ اور علمی و دینی ساکھ سے تحریک کی تائید و حمایت کا کام لیا جس سے تحریک کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی حاصل ہوئی۔

(۶) سپاہیانہ ورزشیں اور مجاہدانہ ریاضتیں کر کے عام مسلمانوں میں جہاد کی تیاری کی اہمیت واضح کی اور اس کا شوق پیدا کیا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

سیّد احمد شہیدؒ

ایک عظیم مجاہد اور مجدّد

۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء — ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء

مجدّد سرہندی اور مجدّد دہلوی کے فضل و کمال اور مجاہدہ و حال کے دو آتشہ سے رائے بریلی کے خمکدہ میں ایک اور سہ آتشہ تیار ہوا یہ سادات حسنی کا خاندان تھا جس میں مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا فیض آکر مل گیا تھا۔ اس خاندان کا آغاز شیخ الاسلام امیر کبیر قطب الدین محمد مدنیؒ سے ہوا جنھوں نے ساتویں صدی ہجری کی ابتداء میں ہندوستان آکر کڑا مانک پور کے نواح میں جو اس زمانہ میں الٰہ آباد سے پہلے الٰہ آباد تھا، جہاد کیا۔

اس خاندان کے آخری مورث شاہ سید علم اللہ ہیں جو عالمگیرؒ کے زمانہ میں تھے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مشہور خلیفہ اور جانشین حضرت آدم بنوریؒ کے فیض سے مستفیض اور مشرق کے دیار میں ان کے خلیفۂ خاص تھے۔ اس خاندان میں حضرت مجدد سرہندیؒ اور مجدد دہلویؒ کی برکتیں اور سعادتیں جمع ہوگئیں۔

تیرھویں صدی کا آغاز تھا کہ اس خاندان میں چودھویں کا چاند طلوع

ہوا۔ (سید سلیمان ندویؒ)

حضرت سید احمد رائے بریلویؒ پچھلی صدی ہجری کے ان اکابر مشاہیر میں گذرے ہیں جن کی یاد مسجدوں اور خانقاہوں کی دنیا الگ رہی لندن اور آکسفورڈ اور کیمبرج کی دنیا کے حافظہ سے بھی محو نہیں ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ان کے تذکرہ سے مزین، انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں ذکر ان کا موجود، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں کارنامے ان کے مذکور۔ یہ الگ بات ہے کہ دوست انھیں عقیدت کی آنکھوں کے اندر جگہ دیتے ہیں اور دشمن کی نگاہ میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں لیکن نظریں اس شہید پر بہرحال پڑتی ہیں۔

اک خونچکاں کفن میں کروروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

جس کا نام ملائکۂ ربانی کے نورانی رجسٹروں میں درج ہوا اس کے تذکروں اور چرچوں سے اگر خاکیوں کے سینے اور آدم زادوں کے سفینے معمور ہوں تو اس پر حیرت ہی کیوں کیجیے۔ (مولانا دریا آبادی)

نام ونسب سید صاحب کا نام سید احمدؒ، والد صاحب کا نام سید عرفان، دادا کا نام سید محمد نور، والد کے دادا کا نام سید محمد ہدیٰ، اور دادا کے دادا سید علم اللہ ہیں۔ اس خاندان میں بیسیوں اولیاء اللہ گذرے ہیں۔

مجاہدین کی بھی اس خاندان میں کمی نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسنؓ کے بعد سید محمد النفس الزکیہ نے علم جہاد بلند کیا تھا۔ خود ہندوستان میں اس خاندان کے بانی سید محمد مدنی بسلسلہ جہاد ہی یہاں تشریف لائے تھے اور کڑا مانک پور کے اطراف میں جہاد کیا تھا۔ اس خاندان میں سید صاحبؒ ماہ صفر

۱۲۰۱ھ میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے رسمی تعلیم بہت کم حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ آپ سے کچھ اور ہی کام لینا چاہتا تھا۔ ہزار کوششیں کی گئیں لیکن آپ کی طبیعت عام مدرسوں کی طرف مائل ہی نہ ہوئی۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ بالکل اَن پڑھ تھے۔

تعلیم و تربیت آپ سترہ سال کی عمر میں جب اپنے شفیق والد کے سایہ سے محروم ہو گئے تو گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ لکھنؤ میں ایک نواب کے یہاں کچھ دنوں قیام رہا۔ پھر دہلی تشریف لے گئے اور شاہ عبدالقادر صاحب (ف ۱۲۳۶ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور شاہ عبدالعزیزؒ (ف ۱۲۳۹ھ) سے بیعت کی۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۲ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ آپ کا پہلا سفر تھا۔ آپ دہلی سے وطن تشریف لے آئے اور تقریباً دو سال وہیں رہے۔ اسی دوران آپ نے شادی بھی کی —— اس کے بعد آپ نے راجپوتانہ کا سفر اختیار کیا جہاں نواب امیر خاں کا قیام تھا۔ راستہ میں دہلی ٹھہرتے ہوئے نواب امیر خاں کے پاس پہنچے۔ سید صاحب کے دل میں جہاد کا شوق تو لڑکپن ہی سے گویا فطری طور پر موجود تھا لیکن شاہ عبدالقادرؒ صاحب کی تعلیم اور خصوصاً شاہ عبدالعزیزؒ کی تربیت نے آپ کے اندر جہاد کا جوش و خروش دوبالا کر دیا بلکہ شوق جہاد کے ذرہ کو ہمالیہ بنا دیا، معمولی قطرہ کو ایک بحر ذخار بنا دیا لیکن یہ جوش نرا جوش نہیں تھا بلکہ ولی اللہی خاندان کے علم و فہم کا ہوش بھی اس کے دوش بدوش موجود تھا۔ اسی ہوش نے آپ کو اچانک اور اندھا دھند جہاد بالسیف شروع کر دینے سے باز رکھا بلکہ تیاری، برسوں کی تیاری پر مجبور کیا چنانچہ آپ امیر خاں کے لشکر میں پہنچے اور فوجی ٹریننگ حاصل کی۔ صرف ٹریننگ ہی حاصل نہیں کی بلکہ امیر خاں کی

فوج میں رہ کر آپ نے فوجیوں اور خود امیر خاں کو جہاد کی ترغیب دلانے اور ان میں شوق جہاد پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔ متعدد لڑائیوں میں آپ ایک دستہ کے سپہ سالار بھی رہے۔ امیر خاں کے مشیر خاص بھی رہے۔

آغاز کار

لیکن امیر خاں اور اس کے فوجیوں سے جب وہ مقصد حاصل ہوتے ہوئے آپ کو نظر نہ آیا جو آپ کے پیش نظر تھا تو آپ واپس دہلی تشریف لے آئے اور جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ ولی اللّٰہی خاندان جس کے آپ شاگرد اور مرید تھے، اس نے آپ کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے داماد مولانا عبدالحئی صاحب (ف ۱۲۴۳ھ) اور شاہ اسماعیلؒ (ش ۱۲۴۶ھ) اور خاندان کے دوسرے سربرآوردہ بزرگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ کیونکہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے صرف علم اور روحانیت کافی نہیں ہو سکتی بلکہ فوجی ٹریننگ اور حربی تربیت بھی درکار ہوتی ہے۔ اور سید صاحب ان تینوں خوبیوں کے حامل اور ان سب کمالات کے جامع تھے۔ اصل میں خلوص اور للّٰہیت وہ بنیادی جوہر ہے جو جذب وانجذاب اور گھلانے کی صفات پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ خاندان ولی اللّٰہی کو اگرچہ علم و تقویٰ کے پہلو سے شان مشیخت حاصل تھی بلکہ اپنے زمانہ کی امامت کا مقام ان کو حاصل تھا مگر خلوص و للّٰہیت کے جوہر نے ان کو سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے باز نہیں رکھا۔ حالانکہ سید صاحب اسی خاندان کے شاگرد اور مرید تھے اور خود سید صاحب کا خلوص تھا جس نے اپنے استاذ اور اپنے شیخ کے خاندان کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

تبلیغی دورے

بہر حال یہ علم و تقویٰ اور شوق جہاد کا قران السعدین مبارک ثابت ہوا۔ ارشاد، ہدایت، اصلاح اور جہاد

کی طرف دعوت کا سلسلہ پھیلنے لگا۔ مولانا عبدالحئیؒ اور مولانا شہیدؒ کے ساتھ آپ نے ملک کا دورہ کیا۔ آپ جہاں جہاں تشریف لے گئے وہاں وہاں آپ کے دم قدم سے توحید کی روشنی پھیلی، شرک و بدعت کی تاریکی دور ہوئی، جہالت کا غبار چھٹ گیا اور اسلام کا چہرہ صاف نظر آنے لگا" اثر انگیزی اور اثر پذیری کے دلفریب مناظر سامنے آئے جن سے عہد صحابہ کی جھلک نظر آنے لگی۔ سید صاحب اور ان کے رفقاء جہاں تشریف لے گئے وہاں کی سرزمین نے انسانی طاقت، ہمت اور حوصلہ کا سونا اگلنا شروع کر دیا۔ آپ کی نگاہ پُر تاثیر نے نہ معلوم کتنے زنگ آلود دلوں کو معرفت کا خزانہ بنا دیا اور نہ معلوم کتنے سینوں کو اصلاح و جہاد کے زندہ جذبہ سے مالا مال کر دیا، جو اسلام کی خاطر اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے تن من دھن سب کچھ قربان کرنے اور سرمایۂ حیات تج دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ صوبہ بہار کے ایک رئیس زادے ولایت علی صادق پوری نے لکھنؤ میں آپ کو دیکھا، ملاقات کی اور نقد دل ہار بیٹھے اور پھر اپنی ذات ہی نہیں اپنے پورے خاندان کو قدموں میں لا ڈالا۔ پھر جب سید صاحب پٹنہ تشریف لے گئے تو صادق پور ہی نہیں، عظیم آباد ہی نہیں، پورے بہار نے اپنے بہادر، اپنے لعل و گوہر آپ کی گود میں لا ڈالے۔ مولانا مسعود عالم صاحبؒ کے بقول "گورنمنٹ آف انڈیا کا ریکارڈ اٹھا کر دیکھو، مقدمات سازش کی روداد یں پڑھو، سرحد اور ماوراء سرحد کی پہاڑیوں اور دشوار گذار گھاٹیوں سے پوچھو! سید صاحب کی شہادت (۱۲۴۶ھ ۔ ۱۸۳۱ء) سے لے کر پورے سو برس (۱۸۳۱ء ۔ ۱۹۳۱ء) تک جس طرح اس خاندان نے جہاد کا علم سربلند رکھا وہ قربانی اور سرفروشی کی تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔"

سید صاحب نے اپنے رفیقوں کے ہمراہ جو ملک کے مختلف مقامات کا

دورہ کیا اس کے اثرات سے صرف یہی نہیں ہوا کہ توحید کی روشنی پھیلی اور بدعات کی تاریکی چھٹی بلکہ ایک طرف اگر لاکھوں مسلمانوں نے بیعت کی تو دوسری طرف ہزاروں غیر مسلم آپ کی تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

حج جہاد سے پہلے آپ نے حج کرنا زیادہ مناسب خیال کیا کیوں کہ اس وقت سفر حج بھی مستقل جہاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ بدامنی، لوٹ مار اور سفر کی صعوبتوں کے باعث بعض علماء نے حج کے سقوط کا فتویٰ دے رکھا تھا۔ اس طرح دین کا ایک رکن منہدم ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس ستون کو کھڑا کرنے کے علاوہ اس میں ایک مصلحت یہ بھی پوشیدہ تھی کہ جو رفقاء سفر حج کی صعوبتیں برداشت کرسکیں گے ان پر جہاد بالسیف کے سلسلہ میں زیادہ اعتماد کیا جاسکے گا۔ ایسے لوگ خود بھی اپنے اوپر زیادہ اعتماد کرسکیں گے۔ خدا پر بھروسہ کے بعد اپنے اندر ہمت اور اپنی طاقتوں کا اندازہ اور ان پر اعتماد کسی بھی اہم کام کے لیے بہرحال ناگزیر ہے۔ ایک فائدہ اور پیش نظر تھا۔ اثنائے سفر میں تبلیغ اور رشد و ہدایت کا بھی سلسلہ آپ نے جاری رکھا۔ چنانچہ ہزاروں نے ہدایت پائی۔ تقریباً ۳ برس اس سفر میں صرف ہوئے۔ ۲ر جون ۱۸۲۱ء (یکم شوال ۱۲۳۶ھ) نماز عید کے بعد رخت سفر باندھا، چار سو مرد، عورتیں اور بچے آپ کے ہمراہ تھے۔ منزل بمنزل قیام کرتے ہوئے یہ قافلہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہو کر ۳۰ر اپریل ۱۸۲۴ء کو واپس آگیا۔ ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر کی غلط بیانی ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں "سید صاحب کو مکہ معظمہ سے نکالا گیا اور ان کے ساتھ برا سلوک کیا گیا" حالانکہ سید صاحب حج سے فارغ ہونے کے بعد بھی سات آٹھ مہینے حرم میں قیام فرما رہے اور بلاد حرم کے ممتاز علماء آپ کی صحبت سے فیضیاب

ہوئے۔

جہاد حج کے بعد دعوت تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ مولانا عبدالحئیؒ اور مولانا شہیدؒ کو اور دوسرے ممتاز رفقاء کو مختلف اطراف میں بھیجا گیا۔ جہاد کی عملی تیاری بھی ہونے لگی۔ اس وقت پنجاب میں سکھوں کا ظلم زوروں پر تھا۔ سکھ شاہی مظالم سے مسلمانوں کی عبادت گاہیں، ان کی عورتیں اور بچے اور وہ خود کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔ مسجدوں کو اصطبل بنادیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی جان، مال اور آبرو کو پامال کیا جارہا تھا۔

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

جس ملک میں مسلمانوں نے حکومت کی تھی اور گلچھرے اڑائے تھے شاید صحیح اسلامی حکومت قائم نہ کرنے کی سزا میں اسی ملک میں ان کا خون ارزاں تھا اور اسی ملک کا چپہ چپہ ان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔

پنجاب کے قرب وجوار میں مسلمان ریاستیں اب بھی موجود تھیں سرحد میں پٹھانوں کے مختلف خاندان اب بھی اپنی نسلی شرافت اور شجاعت پر نازاں تھے۔ لیکن سکھ شاہی مظالم کے خلاف اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر سردھڑ کی بازی لگانے اگر کوئی اٹھا تو وہ چند سر پھرے مولوی اور ملا ہی تھے، جن کی آواز پر سچے مسلمان اپنا تن من دھن سب قربان کرنے اور تج دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

کامیابی اور شہادت اللہ کے بے برگ وسامان بندے صرف اللہ کی توفیق کے بھروسے پر سید صاحب کی قیادت میں، مولانا شہیدؒ کی رفاقت میں گھر بار چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور گھومتے گھامتے پنجاب کے دوسری جانب پہنچے! اس طرح انھوں نے اپنی

مرضی کا محاذ جنگ منتخب کیا اور بہترین جنگی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا خوب خوب معرکہ آرائیاں ہوئیں، شمشیر زنی اور توپ افگنی کے جوہر دکھائے گئے، جانیں لیں اور جانیں دیں، سر کاٹے اور سر کٹوائے، کفار کے مردار خون سے زمین رنگین کرنے والوں نے آخر اپنے حیات بخش خون سے زمین کو لالہ زار کر دکھایا۔

ہوا یوں کہ پشاور کی سرزمین نے اطاعت میں سبقت کی! امکان پیدا ہو چلا تھا کہ سارا پنجاب اور سرحد کا تمام علاقہ اسلامی نظام کے نور سے جگمگا اٹھے اور ایک بار پھر خلافت راشدہ کا عملی نمونہ سامنے آجائے مگر ابھی نام کے مسلمانوں کے برے دن لکھے تھے اور سچے مسلمانوں کی ابھی آزمائش باقی تھی ـــــ بُرا ہو نسلی غرور کا، برا ہو قبائلی عصبیت کا، برا ہو جہالت کا، اور ستیاناس ہو علماء سوء کی پھوٹ ڈالنے والی حرکات کا۔ اور خدا معاف کرے مخلصین کی بے صبری، بے تدبیری اور ناتجربہ کاری کو، سب نے مل ملا کر کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ حنفیت اور وہابیت کے جھگڑے کھڑے کر دیے گئے۔ قبر پرستوں نے سرفروشان اسلام پر کفر کے فتوے داغے۔ سرحد کے پٹھانوں نے غداری کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف پشاور ہاتھ سے نکل گیا بلکہ سید صاحبؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ دونوں بالاکوٹ میں شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

"بالاکوٹ کی سرزمین! تجھ پر اللہ کی ہزار ہزار رحمت کہ تیری خاک میں امت کی بہترین آرزوئیں آسودۂ خواب ہیں" ـــــ اور ـــــ

" بالاکوٹ کی تربت میں آرام کرنے والو! تم پر اللہ کی رحمت اور سلام! تمہاری ہڈیاں پھولوں میں رہیں اور اللہ تمہیں شہداء اور صالحین کی صف میں جگہ دے۔" مولانا مسعود عالمؒ کی ان دعاؤں پر آمین کہو۔ آمین اللّٰہم آمین۔

پیغامِ عمل سید صاحبؒ کی دعوت خالص کتاب و سنت کی طرف تھی۔ بدعت اور شرک کو مٹانا آپ کا مشن تھا۔ وہ دین کی شوکت چاہتے تھے، دین کا غلبہ چاہتے تھے، اقامت دین ان کا نصب العین تھا۔ شہادت حق کی خاطر وہ اٹھے تھے اور اسی کی خاطر انھوں نے اپنی اور اپنے رفقاء کی شہادت کا نذرانہ بارگاہ خداوندی میں پیش کر دیا۔

آپ کے عہد میں شرک کا زور تھا۔ باطل پرستوں، انگریزوں اور سکھوں کا اقتدار تھا۔ قبر پرستی اور تعزیہ داری کا رواج عام تھا۔ بیوہ کا نکاح گویا جرم بلکہ گناہ تھا۔ عقیدہ و فکر، سیاست و مذہب، معاشرت اور معیشت کی ان تمام خرابیوں پر آپ کی نگاہ تھی۔ آپ نے ہمہ جہتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا۔ توحید خالص کی دعوت، قبر پرستی اور تعزیہ داری کا استیصال، نکاح بیوگان کی ترویج آپ کی کوششوں کا ہدف تھے۔ عامۂ خلائق کو امن و امان کی نعمت سے مالا مال کرنا، مظالم کی روک تھام اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا دین محمدؐ کو غالب کرنا اور شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ یہ تھا آپ کا مشن اسی کا پیغام دیتے، اسی کی طرف آپ کی دعوت تھی، اسی کے لیے آپ نے تحریک چلائی اور اسی کے لیے تن من دھن آپ نے اور آپ کے رفقاء نے تج دیا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

سردار سلطان محمد خاں اور سردار سعید محمد خاں کو خود سید صاحب رح نے تحریر فرمایا: "رب غیور جو کہ دلوں کا حال اچھی طرح جانتا ہے، اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس منصب (امامت) کے قبول کرنے سے اس کے سوا میری کوئی دوسری نفسانی غرض نہیں کہ جہاد کو شرعی طریقے پر قائم کیا جائے اور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو —— ہاں اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افراد انسانی بلکہ تمام ممالک میں رب العلمین کے احکام جن کا نام شرعِ متین ہے بلا کسی کی مخالفت کے جاری ہو جائیں" [۱]

ناکامی کے اسباب

حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو برس کام کرنے کے بعد بھی ظاہری ناکامی کے باوجود حقیقی اعتبار سے کامیاب و بامراد رہے تو سید صاحب کو بھی ناکام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مومن کا تو معیار کامیابی و ناکامی نرالا ہی ہے۔ البتہ ظاہری طور پر ناکامی کا جو آپ کو منہ دیکھنا پڑا تو اس کے بھی کچھ اسباب تھے۔ سید صاحب اور مولانا شہید رح اور آپ کے رفقائے کار کے خلوص اور تقویٰ کے پیش نظر یا آپ سے عقیدتمندانہ جذبات کی خاطر اگر ان اسباب سے صرف نظر کیا جائے تو یہ درحقیقت آپ کے مشن کی طرف سے ناقابل معافی جرم کا ارتکاب ہوگا، جو غلبۂ اسلام کے لیے کوشش کو لوگوں کی نظر میں بیکار ٹھہرائے گا اور امت کے اندر ایک مایوسانہ ذہنیت کو پیدا کرنے کا سبب بنے گا کہ جب ایسے بزرگوں کی کوشش

---

[۱] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۵۱

ناکام رہی تو ہم کیا اور ہماری کوشش کیا؟

(۱) آپ نے جس علاقہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا تھا یعنی صوبہ سرحد اور آزاد قبائل کا علاقہ وہاں کے عوام کی تعلیم و تربیت کا آپ انتظام نہ فرما سکے۔ فوری اور وقتی تبلیغ سے کچھ قبیلے آپ کے ہم نوا ہو گئے مگر جس قدر جلد وہ آپ کے ساتھ ہوئے اتنی ہی جلد وہ پلٹ بھی گئے اور غداری کا ارتکاب کرنے میں بھی انھوں نے اتنی ہی چستی کا ثبوت دیا۔

(۲) اسلامی حکومت کے لیے اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے اسلامی ذہن رکھنے والے عوام بھی درکار ہیں اور عوام کا ذہن بنانے کے لیے مدت دراز تک دعوت و تبلیغ کی بھی ضرورت ہے۔ صبر کے ساتھ مسلسل اور پیہم جان گھلائے بغیر یہ کام ناممکن ہے۔ خود حضورؐ نے اسی تدریج سے کام لیا۔ تیرہ سالہ مکی زندگی کی آزمائشیں اور ان آزمائشوں کی بھٹی میں تپنے کے بعد کندن بن کر نکلے ہوئے کارکن بھی درکار ہیں۔ عجلت اور بے صبری سے کام بگڑتا ہی ہے بنتا نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ میں تدریج سے کام نہیں لیا گیا۔

کارنامے آپ کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ ولی اللّٰہی خاندان کی علمی اور فکری کوششوں کو فروغ آپ کی تحریک سے حاصل ہوا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی حالت پر خاصہ اچھا اثر نمایاں ہوا۔ مثلاً نکاح بیوگان کا رواج ہوا، اسلامی آداب کی طرف سے جو غفلت عام تھی، حتیٰ کہ السلام علیکم کے بدلے "آداب عرض کرتا ہے" کا رواج خواص تک کے گھروں میں تھا، اس شعار اسلامی کا رواج عام ہوا۔

(۳) شرک و بدعت کی بھیانک تاریکی چھٹی اور توحید خالص کا نور

پھیلا اور اسلام کا چہرہ نمایاں ہوا۔

(۴) امت مسلمہ کے تن مردہ میں آپ نے روح جہاد پھونکی اور مجاہدین مخلصین کا ایک عظیم گروہ اسی امت کے اندر سے حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔

(۵) دین و شریعت کے اصل ماخذ قرآن و سنت سے خواص اور عوام کو قریب لانے میں خاصی کامیاب کوشش فرمائی۔

(۶) امت مسلمہ کو نہ صرف نماز، روزہ کی پابندی کا خوگر بنانے کی فکر کی بلکہ حج کا فریضہ جو تقریباً ساقط ہو چکا تھا اسے زندہ کیا اور حبِّ دنیا میں ڈوبی ہوئی امت مسلمہ کے عوام اور خواص کو مالی قربانی کی طرف متوجہ کرنے میں بھی آپ نے کامیابی حاصل فرمائی۔

(۷) نہ صرف عقائد دین اور ارکان دین کی طرف سے آپ نے غفلت کو دور کیا بلکہ فریضۂ جہاد کو عملاً زندہ کیا۔

(۸) آپ نے ثابت کیا دینداری صرف مسجد اور پرسنل لا تک محدود نہیں ہے بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کوشش کرنا اور تیغ و سنان سے کام لے کر قانون الٰہی کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرنا بھی عین دینداری ہے۔

(۹) آپ کو جب پشاور میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کرنے کا موقعہ ملا تو آپ نے ٹھیٹ اسلامی حکومت قائم کی اور دور جدید میں صدیق رضؓ و فاروق رضؓ کی حکومت کا ایک بار پھر نمونہ قائم کر کے دکھا دیا۔

(۱۰) غرض کہ آپ نے عوام اور خواص کے دین و اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ وسیع پیمانہ پر جہاد کی تیاری اور تنظیمی صلاحیتوں کا بہترین ثبوت دیا۔ آغاز کار کے لیے شمالی مغربی ہند کا انتخاب کر کے

بہترین تدبر اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔

(۱۱) مولانا عبدالاحد صاحب مصنف سوانح احمدی لکھتے ہیں:۔

"حضرت سید احمد صاحب قدس سرہ کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلہ بیعت آپ کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء کے ذریعہ تمام روئے زمین پر جاری ہے اس سلسلہ میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں۔"

مولانا علی میاں لکھتے ہیں:۔

"صرف مولوی کرامت علی صاحب جون پوریؒ کی کوششوں سے جو آپ کے مشہور خلیفہ تھے، بنگال میں لاکھوں آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے۔"

(۱۲) آپ کی تحریک صرف ہندوستان گیر نہیں تھی بلکہ بیرون ہند بھی اس کے اثرات پہنچے۔

چنانچہ دہلی، کلکتہ، سندھ، سرحد، حیدرآباد دکن، بمبئی، مدراس یو، پی، بہار کے علاوہ نیپال، افغانستان، تبت، جاوا، بلغاریہ، مراکش وغیرہ تک آپ کے خلفاء پہنچے اور اصلاح و تجدید کا کام انجام دیا۔

۲۴۰

بار اوّل ——— جون ۱۹۷۹ء ——— ۲۰۰۰

قیمت -/۷

مطبوعہ

جے۔ کے۔ آفسٹ پرنٹرز۔ دہلی ۶

سرورق ٹائٹل: بی آرٹ پریس دہلی میں چھپا